رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

جلد ۳ عدد ۳

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

•

دفترِ رسالہ میثاق

رحمان پورہ اچھرہ - لاہور (پاکستان)

قیمت فی پرچہ : دس آنے
سالانہ : چھ روپے (بارہ شلنگ)

Monthly MEESAAQ Lahore

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۰ء مطابق ربیع الاول ۱۳۸۰ھ | عدد ۳

فہرست مضامین

تذکرہ وتبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ——— " ——— ۹

مطالعہ حدیث

غربت اسلام ——— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——— ۲۰

مراسلہ ومذاکرہ

• سلطنت اسرائیل اور یہود سے متعلق قرآن کی پیشین گوئی

• سورہ روم کی ایک آیت کی تاویل • تدبر قرآن میں بعض مسامحات (امین احسن اصلاحی) ۲۷

اجتماعیات وسیاسیات

اسلام کا شورائی نظام ——— مولانا سید جلال الدین انصر عمری ——— ۳۷

مقالات :-

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب ——— مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی ——— ۵۲

تقریظ وتنقید : ——— ۵۶

ہندوستانی خریداروں کے لیے
ارسال زر کا پتہ : مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۱۱۔ احمد سٹریٹ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

جولائی کا آخری ہفتہ میں نے سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری اور سردار امین خان صاحب لغاری کے پاس رحیم آباد (ضلع رحیم یار خاں) میں گذارا۔ اس سفر سے میرے پیشِ نظر تو صرف دو مقصد تھے، ایک اپنے ایک مخدوم و محترم بزرگ جناب حکیم نور الدین صاحب کی عیادت جو عرصہ سے بیمار ہیں اور میں اپنی کوتاہی کے سبب سے اب تک ان کی عیادت نہ کر سکا تھا[لہ]، دوسرا چند دنوں کے لیے دفتر میثاق کی مصروفیتوں سے الگ ہو کر اجمل باغ کے پرسکون ماحول اور اس کے لذیذ آموں سے فائدہ اٹھانا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے انہی دنوں میں وہاں ملتان سے محمد باقر خاں صاحب اور مرزا مسرت بیگ صاحب بھی پہنچ گئے۔ ان دوستوں کی موجودگی نے ایک اہم تعلیمی و تربیتی پروگرام پر غور و بحث کے لیے بھی ایک عمدہ موقع فراہم کر دیا اور اس طرح یہ ذاتی سفر ایک اجتماعی اور تعلیمی سفر بھی بن گیا اور کیا عجب کہ آئندہ یہ کسی مفید تعلیمی اور اصلاحی خدمت کی تمہید ثابت ہو اور اس کے کچھ عمدہ نتائج سامنے آئیں۔

سردار محمد اجمل خان صاحب نے اپنے باغ میں چند سالوں سے ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے۔ یہ مدرسہ اگرچہ ابھی اپنے ابتدائی ہی مرحلہ میں ہے یعنی صرف میٹرک کے درجہ تک پہنچ سکا ہے لیکن مجھے اس گٹھلی کے اندر ایک تناور

لہ ان دنوں حکیم صاحب موصوف بغرض علاج میو اسپتال لائے گئے ہیں۔ احبابِ مخلصین سے درخواست ہے کہ ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

درخت پیدا کرنے کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ ابتدا ہی سے ایک اقامتی مدرسہ ہے۔ طلبہ کی اصلاح و تربیت کے لیے اس میں ایک پاکیزہ دینی و اسلامی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باقاعدہ پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے جس میں طلبہ، اساتذہ اور سردار صاحب خود پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اساتذہ اسلامی ذہن و کردار رکھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی صحبت بجائے خود طلبہ کے لیے دینی نقطۂ نظر سے نہایت مفید ہے۔ ابھی تعلیم اور رہائش کے لیے ضرورت کے مطابق عمارتیں نہیں بن سکی ہیں اس وجہ سے کلاسیں زیادہ تر باغ کے درختوں کے سایہ ہی میں لگتی ہیں۔ میرے نزدیک صحت و صفائی کے نقطۂ نظر سے یہ چیز بجائے خود ایک نعمت ہے۔ امتحانات کے نتائج کے لحاظ سے بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا ریکارڈ نہایت شاندار ہے۔

ان میں طلبہ زیادہ تر سردار صاحب کے اپنے ہی خاندان کے ہیں جو اس مدرسہ میں اگر نہ ہوتے تو غالباً چیفس کالج (لاہور) میں ہوتے اور اسی کے غلط ماحول کے اثرات میں پرورش پاتے۔ یہ سردار صاحب کی ایک دینی خدمت ہے کہ انھوں نے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سادہ مذہبی ماحول پیدا کر دیا۔ اگرچہ یہ تعلیم و تربیت ابھی ان بچوں کی صرف ابتدائی زندگی ہی تک محدود ہے۔ اس مدرسہ سے نکلنے کے بعد ان کو اسی ماحول سے سابقہ پیش آئے گا جو اس وقت عام کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ہے لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک بندۂ خدا نے جس حد تک اس سے ہو سکا ان معصوموں کو برے ماحول سے بچانے کی کوشش کی اور ان کے دلوں پر خدا اور اس کے رسول کے کچھ نقش قائم کر دیئے، کیا عجب کہ ان میں کچھ سعید روحیں ایسی بھی نکلیں جو اپنی آئندہ زندگی میں بھی ان نقوش کی حفاظت کر سکیں اور یہ چیز خود ان کے لیے بھی ذریعہ نجات و فلاح ہو اور اس کے لیے بھی وسیلہ مغفرت بنے جس نے آج یہ نقوش ان کے دلوں پر قائم کرنے کے لیے اپنے لیے ایک بہت بڑا دردِ سر خرید لیا ہے۔

سردار صاحب کو اس مدرسہ میں جو انہماک ہے وہ اس پہلو سے بڑا مبارک ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی فرصت و فراغت کو ایک ملی و اسلامی خدمت میں صرف کر رہے ہیں۔ جس شخص کو فکر معاش کی الجھنوں اور مصروفیتوں سے فراغت حاصل ہو میں اس کے لیے اس بات کو اللہ تعالیٰ کی بڑی ناشکری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی فرصت و فراغت بھی دنیا کے مزید حصول کی فکروں میں کھپا دے جو اس کو حاصل ہے۔ ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ واجب ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی اس فرصت و فراغت کو اس کی یاد میں، اس کے دین کی خدمت میں اور ملت اسلامیہ کی

ترقی واصلاح کے کاموں میں صرف کرے، یہی اس فرصت وفراغت کی اصلی قدر وقیمت ہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس فرصت کو اسی دنیا کے مزید حصول کی سرگرمیوں میں ضائع کردیا تو وہ ایک بدقسمت انسان ہے جس نے بہت بڑی نعمت پائی لیکن وہ ایک نہایت ہی حقیر مصرف پر گنوا دی۔ میں نے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ سردار صاحب اگر کچھ بھی نہ کرسکیں، صرف اپنے خاندان اور بستی کے بچوں ہی کو موجودہ برے ماحول سے بچا کر تعلیم دلا سکیں تو یہ بھی ایک بڑی خدمت ہے اور اس طرح وہ اس نعمت فراغت کا کچھ حق ادا کرسکیں گے جو اللہ نے انھیں بخشی ہے۔

اپنے چند روزہ قیام میں، مختلف باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ سردار صاحب نے یہ کام محض ایک مشغلہ تفریح (HOBBY) کے طور پر نہیں اختیار کیا ہے بلکہ یہ ان کے دل کی ایک لگن ہے۔ وہ اپنے اوقات کا ایک نہایت اچھا حصہ اس کی دیکھ بھال پر صرف کرتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے مالٹوں کا نہایت اچھا باغ کٹوا کر اس کے پلاٹوں میں ایک سادہ اور ہوادار مسجد بنوا دی ہے۔ مسجد کے ایک بازو پر ایک ہوسٹل کی تعمیر میرے سامنے تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ مسجد کے دوسرے بازو پر بھی کتب خانہ اور تعلیم وتدریس کے مقاصد کے لیے عمارتیں بنانے کی تیاریاں ہیں۔ اپنے منصوبوں پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے سردار صاحب نے ایک خود کفیل یونیورسٹی کا تخیل بڑے ذوق وشوق سے پیش کیا بلکہ دوران گفتگو میں انھوں نے یہ یاد دہانی بھی کی کہ راقم سطور کے رسالہ الاصلاح میں انھوں نے امریکہ کی ایک اسی طرح کی یونیورسٹی کے حالات کسی زمانہ میں بڑی دلچسپی سے پڑھے تھے۔ ان کی ان باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ چیز محض سرسری اور سطحی نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں نیچے بہت دور تک جاتی ہیں اور کیا عجب کہ خدا وہ دن لائے کہ مالٹوں اور سنگتروں کے اس باغ کی جگہ علم وفن اور دین و دانش کا ایک چمنستان آباد ہوجائے۔

مدرسہ کے طلبہ کی ایک ادبی تقریب میں بھی شریک ہونے کا راقم سطور کو موقع ملا۔ اس میں طلبہ نے اردو، عربی، انگریزی تینوں زبانوں میں اپنے مضامین، تقریریں، مکالمے، ڈرامے پیش کیے۔ ان چیزوں کا معیار ادبی اعتبار سے بھی قابل ستائش تھا اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ہر چیز قابل تعریف تھی۔ مسلمان بچوں کے ہر کام میں جو دینی واخلاقی روح جاری وساری ہونی چاہیے وہ ان کے ایک ایک فقرہ سے نمایاں ہورہی تھی۔

مجھے یہ چیز بہت پسند آئی اور میں نے اس پر طلبہ اور مدرسہ کے اساتذہ کو مبارکباد دی۔

اس دوران قیام میں مجھے لغاری خاندان کے ان بزرگوں اور نوجوانوں سے بھی ملنے کے متعدد مواقع حاصل ہوئے جو خاص رحیم آباد میں مقیم ہیں۔ ان لوگوں کے اندر بعض روایات بڑی پسندیدہ ہیں ان کے چھوٹے بڑوں کی عزت کرتے ہیں اور بڑے چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر دین کے احترام اور اس کی خدمت کی خواہش بھی ایک مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تہذیب وشائستگی (جدید معنوں میں نہیں، اپنے قدیم معنوں میں) ان لوگوں کے اندر ان کے خاندان کی شہرت کے شایان شان ہے۔ مجھے جب جب ان حضرات سے گفتگو اور خطاب کے موقعے ملے میں نے ان کو اسی بات کی طرف توجہ دلائی جس کا ذکر اوپر کرچکا ہوں۔ یعنی اس بات کی طرف کہ اللہ تعالے نے آپ حضرات کو جو وسائل وذرائع بخشے ہیں ان کو اسی دنیا کے بنانے اور سنوارنے میں نہ صرف کیجیے جو آپ حضرات کو حاصل ہے بلکہ ان کو قوم وملت کی تعمیر وترقی پر صرف کیجیے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری معروضات بڑی توجہ اور ہمدردی کے ساتھ سنی گئیں جس کے لیے میں ان سب حضرات کا شکرگزار ہوں۔

رحیم آباد کے پاس ایک بستی میرے شاہ ہے۔ یہاں ہمارے ایک خوش حال اور خوش خصال کرم فرما فیض احمد صاحب ہیں۔ انھوں نے ایک روز اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور بڑی پرتکلف دعوت کی۔ یہاں مجھے سردار محمد اجمل خاں صاحب اور فیض احمد صاحب کی معیت میں یہاں کے مدرسہ خدام القرآن کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مدرسہ کے مہتمم صاحب اور اس کے اساتذہ نے بڑی محبت ومہربانی کے ساتھ ہمیں مدرسہ کے ہر گوشہ کی سیر کرائی۔ اس مدرسہ کے احاطہ میں ۳۰۵ طلبہ شب وروز قیام کرتے ہیں۔ احاطہ کا لفظ میں نے بالقصد اس لیے استعمال کیا ہے کہ ابھی ان کے لیے باقاعدہ ہوسٹل یا دار الاقامہ کی قسم کی کوئی چیز نہیں تعمیر ہوسکی ہے، صرف چند خام قسم کے مکانات بنا لیے گئے ہیں۔ یہ ۳۰۵ طلبہ ان طلبہ کے علاوہ ہیں جو قریب کی بستیوں سے روزانہ صبح کو آتے اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ ان طلبہ کی عظیم اکثریت چھوٹے بچوں پر مشتمل ہے اور ان میں مدینہ منورہ اور افریقہ تک کے بچے شامل ہیں۔

ننھے ننھے بچوں کی اس فوج کو دیکھ کر میں بڑا حیران ہوا۔ ان میں اکثریت ایسے بچوں کی تھی جو بلا مبالغہ ابھی اپنی ماؤں کی مامتا اور اپنے باپوں کی شفقت کے سخت محتاج ہیں لیکن آفریں ہے ان کے والدین کو جنہوں نے محض تعلیم و تربیت کے خیال سے ان کو اپنے سے جدا کرنا برداشت کر لیا اور پھر ان سے زیادہ آفریں ہے ان استاذوں کو جنہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ میں مدرسہ کے احاطہ میں گشت کرتے ہوئے برابر ان معصوموں کے چہروں کو دیکھتا رہا کہ ان پر اداسی اور افسردگی تو نہیں ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ان کو اس ماحول میں خوش اور مطمئن پایا۔ افریقہ کے ایک چھوٹے بچے سے جو صرف انگریزی بولتا اور سمجھتا تھا، لغاری صاحب نے پوچھا تم یہاں خوش ہو؟ اس نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ بچوں کے کپڑے بھی عام طور پر صاف ستھرے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ منتظمین ان کو صاف ستھرا رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے ان بچوں کے لیے ماں، باپ، بھائی بہن اور استاذ و مربی سب کی ذمہ داریاں بیک وقت اٹھالی ہیں۔

اس مدرسہ کے اساتذہ کا ایثار نہایت قابل تعریف ہے۔ اگرچہ دینی مدارس میں اس ایثار کی مثالیں نایاب نہیں ہیں تاہم ان حضرات کا ایثار طبیعت کو متاثر کرنے والا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ۲۰ اساتذہ کے اسٹاف پر صرف دو ہزار روپے ماہوار خرچ ہوتے ہیں اور اسی کے اندر مدرسہ کے چپراسیوں اور بعض دوسرے ملازمین کی تنخواہیں بھی شامل ہیں۔ یعنی ایک استاذ کی تنخواہ پورے سو روپے ماہوار بھی نہیں۔ اس زمانہ میں اس ایثار کا تصور صرف کسی دینی درسگاہ ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ جدید طرز کی کسی درسگاہ میں تو اتنی رقم اس کے کلرکوں اور جاروب کشوں کی تنخواہ کے لیے بھی کافی نہ ہو۔ مدرسہ کو جو آمدنی عام مسلمانوں کے عطیات وغیرہ سے ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ وظائف پانے والے طلبہ پر خرچ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بات خوشی کی ہے کہ اس مدرسہ میں ڈیڑھ سو کے قریب ایسے طلبہ بھی ہیں جو کسی نہ کسی حد تک اپنے مصارف کا بار خود اٹھاتے ہیں۔

مغرب کی نماز ہم نے مدرسہ کی مسجد میں پڑھی۔ اس احاطہ میں شاید یہی ایک عمارت ایسی ہے جو پکی اینٹوں سے تعمیر ہوئی ہے اور یہ بھی ابھی بالکل ناتمام حالت میں ہے۔ میں نے نماز کے وقت دیکھا کہ تمام بچے بڑے قرینہ کے ساتھ صفوں میں آکر بیٹھ گئے۔ مہتمم صاحب سے میں نے پوچھا کہ نمازوں کی حاضری کے مسئلہ میں آپ لوگ ان

بچوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ یہاں کا ماحول خود ان بچوں کو نمازوں کے اوقات میں کھینچ کر مسجد میں جمع کر دیتا ہے، اس کے لیے ہمیں کوئی سختی نہیں کرنی پڑتی۔

نماز کے بعد مہتمم صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان طلبہ اور اساتذہ کے سامنے کچھ کہوں۔ چنانچہ ان کی خواہش پر میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس زمانہ میں دین اور دینی تعلیم پر جو دور غربت طاری ہے میں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ سے کہا کہ آپ حضرات جو کام کر رہے ہیں اس کو حقیر نہ سمجھیں، یہ کام دنیا کی نگاہوں میں حقیر ہو لیکن اللہ کی نگاہوں میں اس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ آپ ہی حضرات جیسے ایثار پیشہ لوگوں کی محنتوں کا یہ ثمرہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں قال اللہ و قال الرسول کا چرچا باقی رہا ورنہ شیطان کی کوششیں ایسی منظم تھیں اور ایسی منظم ہیں کہ ان خطوں سے علم دین کا نشان بھی مٹ گیا ہوتا۔ آخر میں میں نے مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ کو ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جو انھوں نے ان سیکڑوں بچوں سے متعلق جو اس مدرسہ میں موجود ہیں، اٹھا رکھی ہیں اور مدرسہ کی کامیابی و ترقی کی دعا پر اپنی تقریر ختم کی۔

اس مدرسہ کی خاص خصوصیت، جس کا ذکر کیے بغیر میں اس مضمون کو ختم نہیں کرنا چاہتا، یہ ہے کہ اس کے اندر چھوٹے بچوں کے لیے ایک خاص جاذبیت ہے۔ یہ جاذبیت کیا ہے اور کیوں ہے؟ ان سوالوں کے جواب دینا میرے لیے مشکل ہے۔ میں ایک واقعہ کی حیثیت سے اس جاذبیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ اگر یہ جاذبیت اس کے اندر نہ ہوتی تو آخر ہماری قوم کے اتنے نونہال اس دور دراز دیہات میں کس طرح اکٹھے ہو جاتے۔ جب اس مدرسہ نے اپنی یہ صلاحیت از خود قوم کے سامنے ظاہر کر دی ہے تو قوم کا فرض ہے کہ وہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھائے اور اس کے لیے وہ اسباب و وسائل فراہم کرے جس سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ ایک معیاری درسگاہ بن جائے۔ سب سے پہلے تو اس کے اندر بچوں کے قیام کے لیے موزوں دارالاقاموں کی تعمیر کی ضرورت ہے، پھر تعلیم گاہ کی تعمیر ضروری ہے۔ بچوں کے لیے مناسب کھیلوں کا انتظام بھی ناگزیر ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ بیرے شاہ کو کسی سڑک سے ملا دیا جائے تاکہ وہاں پہنچنا آسان ہو۔ ہمیں امید ہے کہ دینی احساس رکھنے والے مسلمان اس مدرسہ کی مدد کریں گے تاکہ مدرسہ کی یہ ضروریات پوری ہو سکیں،

اور کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھے۔ یوں تو اس مدرسہ کا تعلق سارے ملک ہی سے ہے کیونکہ ہر حصہ ملک کے طلبہ اس میں موجود ہیں لیکن علاقہ کے مخیر مسلمانوں پر اس کا خاص حق ہے اور ان میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو اگر آمادہ ہو جائیں تو ان کی ادنیٰ توجہ سے اس مدرسہ کی ساری مشکلات حل ہو جا سکتی ہیں۔

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبّرِ قرآن

تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ

اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کے لیے دیجیے تاکہ قرآن مجید کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو

تقطیع $\frac{20\times 26}{8}$ صفحات ۳۶ ، ہدیہ ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک

محصول ڈاک (رجسٹری ۶ ، بک پوسٹ ۱)

سرورق خوبصورت ، طباعت و کتابت دیدہ زیب

ملنے کا پتہ : مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۱۴)

۳۰ - آیات ۴۰ تا ۴۶ میں مطالب کی ترتیب

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت کے بعد اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ مذکورہ بالا مجموعہ آیات میں مطالب کی ترتیب کیا ہے تاکہ کلام کا نظم بھی واضح ہو جائے اور ہر بات کی دلیل بھی سامنے آجائے۔

اس مجموعہ آیات میں پہلے بنی اسرائیل کو تین چیزوں کی یاددہانی کی گئی ہے۔

ایک اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعامات فرمائے ہیں ان کو وہ یاد رکھیں۔ ان کو بھول نہ جائیں۔ یہ انعامات اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوئے ہیں۔ ان کے ذاتی یا خاندانی استحقاق کا نتیجہ نہیں ہیں جن پر وہ آبائی وراثت کی حیثیت سے قابض رہیں۔

دوسری اس بات کی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو وہ پورا کریں۔ وہ اس عہد کو پورا کریں گے تو اللہ تعالیٰ وہ عہد پورا کرے گا جو اس نے ان سے کیا ہے۔

تیسری اس بات کی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔

ان تین باتوں کی یاددہانی کرنے کے بعد ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور یہ دعوت درحقیقت انہی تینوں چیزوں پر مبنی ہے جن کی اوپر یاددہانی کی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

انعام کے پہلو سے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اس لیے ضروری قرار دیا کہ ان کو جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا ہوئی تھیں قرآن کے ذریعہ سے انہی نعمتوں کی تکمیل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں ان پر اپنا آخری فضل فرمایا۔ اور اس فضل کا اس کے ظہور سے پہلے ہی اس نے وعدہ بھی فرمایا تھا تاکہ بنی اسرائیل اس سے بے خبر اور ناآشنا نہ رہیں بلکہ اس سے آشنا اور اس کے منتظر رہیں تاکہ جب یہ نعمت نازل ہو تو خود بھی اس کو بڑھ کر قبول کریں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ جب یہ موعود نعمت نازل ہوئی تو ان کو دعوت دی گئی کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ سب سے بڑا کفران نعمت ہوگا جس کے وہ مرتکب ہوں گے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے امید کا آخری دروازہ بھی بند کرلیں گے۔

عہد کے پہلو سے اس دعوت کو قبول کرنا اس لیے ضروری ٹھہرایا کہ اس کتاب اور اس نبی پر ایمان لانے کا بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا جاچکا تھا۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر پر ایمان نہ لانے کے معنی یہ تھے کہ انھوں نے محض محبت دنیا میں پھنس کر اس عہد کو توڑ دیا جو وہ اپنے رب کے ساتھ باندھ چکے تھے۔

خشیت الٰہی کے پہلو سے اس دعوت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ٹھہرایا کہ ان واضح تصریحات اور ان قطعی عہود کے باوجود جو تورات میں موجود ہیں بنی اسرائیل کی طرف سے اس دعوت کی تکذیب اور مخالفت کی راہ میں پیش قدمی ایک ایسی جسارت تھی جو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ ان موہوم اندیشوں کے لیے جو اس دعوت کے قبول کرلینے کی صورت میں نظر آتے ہیں خدا کے اس حتمی عذاب سے بے پروا نہیں ہوجانا چاہیے جو اس دعوت کی تکذیب کی صورت میں لازماً نازل ہو کر رہے گا۔

اس عام یاددہانی اور دعوت کے بعد خاص طور پر ان کے علماء اور لیڈروں کو مخاطب کرکے یہ تنبیہ فرمائی کہ جانتے بوجھتے اور کتاب و شریعت کا علم رکھتے ہوئے اپنی قوم کو گمراہ کرنے کے لیے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے اور حق کو چھپانے کا وہ کاروبار انھیں نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ اس وقت پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ انھیں کتاب و شریعت کا جو علم ملا ہے اس کا اصل حق یہ ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنے عوام کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کریں نہ کہ اس منصب سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کو اندھا بنانے کے لیے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکیں۔

عوام اور خواص دونوں طبقات کے اس بگاڑ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بالترتیب مذکورہ دونوں

خرابیوں کا علاج بھی بتایا۔

پہلے اس عام خرابی کو لیا ہے جو کفران نعمت، نقض عہد الٰہی اور خدا سے بے خوفی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان تینوں بیماریوں کے علاج کے لیے بنی اسرائیل کو تین باتوں کا حکم دیا۔ نماز، زکوٰۃ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا۔

نماز کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ذکر و شکر کا مجموعہ اور ان تمام عہود کا سرنامہ ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوئے ہیں۔ اس کے اہتمام سے ان تمام چیزوں کی تجدید کی راہ کھل جاتی ہے جن پر شریعت الٰہی قائم ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف ہم اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اشارات کرچکے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا کہ یہی اس مرض بخالت اور اس محبت دنیا کا علاج ہے جس کے سبب سے یہود اللہ تعالیٰ کا پیمان توڑنے اور خدا کی شریعت کو دنیا کی متاع قلیل کے عوض فروخت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ یہود پر اس مرض کا جس قدر غلبہ تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ، بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُھُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔

(۷۵ - ۷۷ آل عمران)

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس ایک دینار کی بھی امانت رکھو تو وہ اس کو ادا کرنے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر نہ سوار ہوجاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، وہ جانتے بوجھتے اللہ پر یہ افترا باندھ رہے ہیں۔ اللہ کا معاملہ تو یوں ہے کہ جو اس کے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ ...... تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر قیمت لے رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ ان سے قیامت کے روز بات نہیں کرے گا

اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا حکم اس لیے دیا کہ عام نمازیوں کے ساتھ نمازوں کی حاضری ان کے کبر و نخوت کو توڑے، ان کے اندر خاکساری اور تواضع پیدا کرے۔ اور یہ خاکساری و تواضع ان کے لیے اس بعثت پر ایمان لانے کی راہ کھولے جس پر ایمان لانے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ غرور تھا کہ وہ اسرائیل کے برتر گھرانے سے ہو کر امیوں کے اندر سے اٹھنے والے ایک رسول پر کس طرح ایمان لائیں۔

یہود کے عام بگاڑ کا علاج بتانے کے بعد ان کے علماء کی طرف توجہ فرمائی اور ان کا مرض یہ بتایا کہ وہ عوام کو تو نیکی اور دینداری کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس تلقین کے وقت وہ خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ نیکی اور دینداری کی ان باتوں کے جتنے مخاطب عوام ہیں اس سے زیادہ ان کے مخاطب یہ خود ہیں، اس لیے کہ کتاب الٰہی کے اسرار و رموز سمجھنے اور جاننے والے یہی ہیں۔ اگر یہ اپنے آپ کو بھی اسی طرح خدا اور خدا کے حقوق و فرائض کا پہچاننے والا بنا لیں جس طرح یہ عوام کو بنانا چاہتے ہیں تو چشم زدن میں لوگوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں اس لیے کہ یہ ساری رکاوٹیں انہی کی پیدا کی ہوئی ہیں کسی اور کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان نصیحت کرنے والوں کے خود اپنے کان بالکل بہرے واقع ہوئے ہیں۔

ان تنبیہات و ہدایات کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے بنی اسرائیل اس آخری بعثت پر ایمان لانے کے مشکل کام کو اپنے لیے آسان بنا سکتے تھے۔ وہ طریقہ صبر اور نماز کا طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنی خواہشات و بدعات کو چھوڑ کر اپنی جمی جمائی سیادت و امارت سے دستکش ہو کر قرآن پر ایمان لانا مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ یہ دونوں سہارے اس چڑھائی کو آسان بنائیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے کی فصلوں میں آئے گی

ل؎ کبھی کبھی یہ چیز ذہن میں آتی ہے کہ وارکعوا مع الراکعین میں یہود کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کے جو بندے آج اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کی عبادت کر رہے ہیں، اس عبادت کے خلاف مہم چلانے کے بجائے تم بھی اس عبادت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر اس کا یہ مطلب لے لیا جائے تو پھر یہ ٹکڑا گویا دوسرے الفاظ میں اسی دعوت کا اعادہ ہے جو ... وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم کے الفاظ سے بنی اسرائیل کو دی گئی ہے۔

۳۱ - دین میں نماز کی اہمیت

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز کا ذکر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین (نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ ۴۳) پھر ایک ہی آیت کے بعد فرمایا واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ وانها لکبیرۃ الا علی الخاشعین (اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ اور یہ چیزیں بھاری ہیں مگر ان لوگوں پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں ۴۵)

ظاہر ہے کہ ان دونوں مواقع پر نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ پہلے موقع پر اس کا ذکر اس پہلو سے ہوا ہے کہ ایمان باللہ اور اقرار توحید کے بعد یہی اس عہد و میثاق کی پہلی دفعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے اور دوسرے موقع پر اس پہلو سے ہوا ہے کہ یہی چیز درحقیقت تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید، سب کی مددگار، اور سب کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ شریعت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے اور پھر شریعت کا قیام و بقا بھی اسی پر منحصر ہے۔ پہلے مرحلہ میں اس کا لازمہ زکوٰۃ ہے دوسرے مرحلہ میں اس کا ساتھی صبر ہے۔ دین جب عقیدہ سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کا اولین قدم یہی ہوتا ہے اور پھر دین کی اقامت اور عہد الٰہی کی تجدید کے لیے جو جدوجہد عمل میں آتی ہے اس میں بھی اولین اہمیت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں پر بالاجمال گفتگو کریں۔ اس فصل میں اس پر پہلے نقطہ نظر سے گفتگو کریں گے، اس کے بعد مستقل عنوان سے اس کے دوسرے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

ساتویں فصل میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ تمام احکام شریعت کی بنیاد درحقیقت نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ نماز ان تمام احکام کا سرچشمہ ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہاں موقع کے اقتضا سے ہم چند ایسی آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوا ہے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس میں جس چیز کو حاصل ہے وہ نماز ہے۔ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا ہے:-

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ، وَ	اٹھائے ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے کہا کہ میں

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۲ - مائدہ)

تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہوگے، اور زکوٰۃ دیتے رہوگے اور میرے ... رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہوگے۔ اگر تم یہ سب کچھ کرتے رہوگے تو میں تمہارے گناہ تمہارے اوپر سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، لیکن جس نے اس عہد کے بعد تم میں سے کفر کیا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

•

یہ قرآن مجید نے اس عہد کا حوالہ دیا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں دیکھیے کہ پہلی چیز جس کا ذکر آیا ہے وہ نماز کا قائم رکھنا ہے۔

اسی طرح جہاں بنی اسرائیل کے دورِ زوال و انحطاط کا ذکر کیا ہے وہاں سب سے پہلے ان کے اندر سے جس چیز کے غائب ہونے کا ذکر کیا ہے وہ نماز ہی ہے اور اسی کے غائب ہونے کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ وہ شہوات و خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ فرمایا:۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۵۹ مریم)

پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے تو عنقریب ایک بڑی گمراہی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہد الٰہی پر قائم رہنے کے لیے پہلی چیز جو مطلوب ہے وہ نماز کا قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ فرمایا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ (۱۷۰ اعراف)

جو کتاب الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کی (تو وہی لوگ مصلح ہیں) اور ہم مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب اللہ یا بالفاظ دیگر عہد الٰہی پر قائم رہنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو نماز کو قائم کرنے والے ہوں اور دوسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پر

مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور لوگوں کو اس پر مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھنے کے لیے نماز قائم کریں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس زمین کی اصلاح کرنے والے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی سعی اصلاح کا اجر پائیں گے۔

۳۲۔ صبر اور نماز اقامت دین کی جدوجہد میں وسیلۂ ظفر ہیں

نماز کی یہ اہمیت میثاق الٰہی کے پہلو سے بیان ہوئی ہے جس میں اس کے تابع کی حیثیت زکوٰۃ کو حاصل ہوئی ہے۔ اب ہم مختصر طور پر اقامت دین کی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے جس میں اس کے پہلو بہ پہلو صبر کا ذکر آتا ہے اور جس کی طرف واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ کی زیر بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں تدبر کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں پر رکھا ہے۔ ایک صبر پر اور دوسرے نماز پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے اندر اقامت دین کی جو جدوجہد شروع کی اس میں اپنی قوم کو انہی دو چیزوں سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی۔ فرمایا:۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (۱۲۸ اعراف)

اور موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی کہ اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔

اس آیت میں اگرچہ نماز کی بجائے اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ نماز ہی ہے چنانچہ دوسری آیات میں اس چیز کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں نے جب اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی اور اس راہ کی آزمائشوں سے انھیں سابقہ پیش آیا تو انھیں بھی صبر اور نماز ہی سے مدد حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد چاہو، بےشک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ اور

بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ

(۱۵۳ - ۱۵۷ بقرہ)

ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خطرہ، بھوک اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری دو ان ان ثابت قدموں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کسی آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ راہ یاب و بامراد ہونے والے ہیں۔

ٹھیک یہی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار مکی زندگی کے اس دور میں کی گئی ہے جب آپ نے اسلام کی دعوت بلند کی ہے اور آپ کو ہر طرف سے مخالفوں اور معاندوں نے گھیر لیا ہے۔ چنانچہ مکی سورتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت کے ذکر کے بعد بالعموم آپ کو ثابت قدم رہنے اور ساتھ ہی نماز پڑھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اکثر سورتوں میں مل سکتی ہیں۔ ہم بخیال اختصار صرف چند آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ فرمایا:

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا

(۱۳۰ طٰہٰ)

پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

(۳۹ - قٓ)

پس صبر کرو ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۖ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ

(۴۸ - طور)

اور ثابت قدم رہو اپنے رب کے فیصلہ تک بیشک تم ہماری نگاہوں میں ہو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ صبر اور نماز یہ دو ہتھیار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حق و باطل کی کشمکش میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے دیئے ہیں اور اگر ان دونوں کی فطرت پر

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں باہمدگر ایک دوسرے کو غذا اور قوت بہم پہنچاتے ہیں۔ صبر سے نماز کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور نماز سے صبر کو غذا اور قوت ملتی ہے۔ نماز، جیسا کہ اوپر ہم اشارہ کر چکے، بڑی صبر طلب چیز ہے۔ جب تک کسی شخص میں صبر کی پختہ صفت موجود نہ ہو اس وقت تک وہ نماز کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس پہلو سے صبر نماز کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اسی طرح صبر جس کی اصل حقیقت زندگی کے مراحل میں موقف حق پر ڈٹے رہنا ہے، کسی مضبوط سہارے کے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مضبوط سہارا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو خدا ہی کا سہارا ہو سکتا ہے جو سب سے بہتر طریقہ پر نماز کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (ثابت قدم رہو اور تمہارا ثابت قدم رہنا ممکن نہیں ہے مگر اللہ ہی کے سہارے سے ۱۲۷۔ نحل)

مشکلات و مصائب کے مقابل میں کسی موقف پر جمے رہنا، حوصلہ کو پست نہ ہونے دینا، ایک نہایت اعلیٰ وصف ہے جس کے بغیر نہ کسی فرد کی زندگی سنورتی ہے اور نہ کسی قوم کی زندگی بنتی ہے اسی وجہ سے قومیں اپنے افراد کے اندر اس چیز کو پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتی ہیں۔ اس زمانے میں سب سے بہتر نسخہ اس چیز کی تربیت کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ افراد کے اندر شہرت و ناموری کے جذبہ کو ابھارا جائے یا قومی عزت اور ناموس وطن کی رگ حمیت کو چھیڑا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک قسم کی گرمی دلوں کے اندر ان چیزوں سے بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان چیزوں کا پیدا کیا ہوا نشہ شراب کے نشہ کی طرح عارضی اور عاقبت اندیشانہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب انسان کے عزم و حوصلہ کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ایک طرف اس کی زندگی کے ہر مرحلہ کے لیے ایک موقف حق معین کر دیتا ہے اور اس پر ڈٹ جانے کی تاکید کرتا ہے، دوسری طرف اس کو نماز کے واسطہ سے آسمان و زمین

ﻟﻪ استاذ امامؒ کا خیال تو یہ ہے کہ استعینوا بالصبر والصلوٰۃ میں اصل مقصود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانے کی تاکید ہے اس کے ساتھ صبر کا ذکر جو آیا ہے تو محض اس لیے کہ اس کی حیثیت نماز کے لیے شرط اور ذریعہ کی ہے کیونکہ نماز پر استقلال کے ساتھ جمے رہنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نماز کی بنا پر مولانا کے نزدیک ایک عظیم چلی کی ہے جس کی تعبیر صرف ایک محکم بنیاد ہی پر ممکن ہے۔ مولانا کا استدلال وأمر أهلك بالصلوٰة واصطبر عليها (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر جم جاؤ ۱۳۲۔ طٰہٰ) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے ہے۔ ہمارا نقطہ نظر ذرا اس سے مختلف ہے۔

کی سب سے بڑی طاقت ہے جوڑ کر اس کو زندگی کا یہ ملکوتی نصب العین دے دیتا ہے کہ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (کہہ دو، میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ ۱۶۲۔ انعام) غور کیجیے کہ حق پر استوار رہنے اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو روح اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ تمغے اور انعامات کی لالچوں اور حبِ قومی و وطنی کے کھوکھلے نعروں سے پیدا ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک لطیف نکتہ اور بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ جہاں جہاں نماز کا ذکر اقامت دین کی جدوجہد کے وسیلہ یا ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے وہاں اول تو اس کے ساتھ صبر کا ذکر ضرور ہوا ہے۔ ثانیاً صبر کا ذکر ہر جگہ نماز پر مقدم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو شکست دینے کی جدوجہد میں مقدم شے جو مطلوب ہے وہ مردانہ اقدام اور راہ حق میں عزیمت و استقامت ہے۔ آدمی اگر اپنے اس جوہر کو نمایاں کرے اور ساتھ ہی نماز کا اہتمام کرے تو اس کے اس جوہر کو جلا ملتی ہے اور راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلتا اور اس کا دل ایمان و یقین سے لبریز ہوتا ہے، لیکن آدمی اگر اپنے ارادے اور عزم کو کوئی حرکت نہ دے، بلکہ صرف کسی حجرے میں بیٹھا ہوا اللہ ہو کا ورد کرتا رہے تو یہ نماز زیر بحث مقصد کے لیے بالکل غیر مفید ہے۔

۳۳۔ مذکورہ بالا مجموعہ آیات کی ایک خاص تعلیم اصلاح ملت کے نقطہ نظر سے

مذکورہ بالا مجموعہ آیات سے جو عام تعلیمات و ہدایات نکلتی ہیں بقدر ضرورت ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں اب ہم ایک خاص حقیقت کی طرف توجہ دلائیں گے جو انہی آیات سے نکلتی ہے اور اصلاح امت کے نقطہ نظر سے جس کی بڑی اہمیت ہے۔

اوپر کی فصلوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نماز کو میثاق خداوندی کے اندر ایمان کے بعد اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ میثاق خداوندی کی تجدید کی جدوجہد میں بھی نماز ہی درحقیقت روح اور وسیلہ ظفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اعراف کی آیت ۱۷۰، اَلَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ کی روشنی میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو جو اصل میثاق ہے، پوری مضبوطی سے تھاما جائے، اس پر خود قائم ہو کر دوسروں کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور کسی حال میں بھی یہ حبل اللہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ دی جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اولین عہد کی حیثیت سے بھی اور وسیلہ ظفر اور ذریعہ کامیابی کے پہلو سے بھی نماز کے قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن کے نزدیک یہی اصلاح کا راستہ ہے اور جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں وہی لوگ ملت کے حقیقی مصلح ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔

قرآن حکیم کا یہ بیان تجدید دین و اصلاح ملت کی تمام تحریکات اور تمام دعوتوں کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ دعوت یا تحریک اصلاح ملت کی صحیح دعوت یا تحریک ہے جس کے مبداء و معاد، جس کی ابتدا اور انتہا، جس کے عقیدہ اور عمل اور جس کے نصب العین اور پروگرام دونوں میں نماز اور اقامت نماز کو وہی اولیت و اہمیت حاصل ہو جو اللہ کے عہد اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں، فی الواقع از روئے قرآن اس کو حاصل ہے۔ جس دعوت یا تحریک میں نماز کو یہ اولیت و اہمیت حاصل نہ ہو وہ تجدید دین اور اصلاح ملت کے نقطہ نظر سے ایک بے برکت بلکہ لاحاصل کام ہے، کیونکہ وہ اس ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدید دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

اطلاع

مکتبہ میثاق نے ہر قسم کی دینی اور علمی کتابیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے کتابیں منگانے کے لیے رقوم پیشگی بھیجی جائیں یا کتابیں بذریعہ وی پی طلب کی جائیں۔

مینیجر میثاق

مطالعۂ حدیث

مولانا عبد الغفار حسن صاحب

غربت اسلام

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباءِ

صحیح مسلم، ج ۱ ص ۸۴

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اسلام کی ابتداء غربت کی حالت میں ہوئی، اور غربت کی یہ حالت پھر اسلام پر طاری ہوگی تو مبارکبادی ہے "غرباء" کے لیے۔

ہم معنی روایات مذکورہ بالا روایت کے ہم معنی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ اس میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

وھو یارز الی المسجدین کما تارز الحیۃ الی جحرھا

یعنی اسلام سمٹ آئے گا دو مسجدوں (مسجد حرام مکہ مکرمہ اور مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کی طرف جس طرح سانپ اپنے بِل کی طرف سمٹ آتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان الایمان لیارز الی المدینۃ کما تارز الحیۃ الی جحرھا

یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایمان مدینہ کی طرف سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بِل میں پناہ لیتا ہے۔

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں، عمرو بن عوف سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان الدین لیارز الی الحجاز کما تارز الحیۃ الی جحرھا، ولیعقلن الدین من الحجاز معقل الاروية من رأس الجبل، ان الدین بدأ غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی

بلاشبہ دین حجاز کی طرف سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بِل میں سمٹ آتا ہے۔ بلکہ سرزمین حجاز میں دین اسی طرح پناہ لے گا جس طرح پہاڑی بکری پہاڑ کی چوٹی پر پناہ ڈھونڈتی ہے۔ اسلام کی ابتداء "غربت" کی حالت میں ہوئی ہے ایسا ہی زمانہ اسلام پر پھر عود کر آئے گا۔ ایسی حالت میں "غرباء" کے لیے مبارکبادی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو میری سنت کے اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد لوگ اس میں پیدا کردیں گے۔

•

اہم کلمات کی تشریح اس حدیث میں "غریب" اور "سنت" دو لفظ ایسے ہیں جن کی تشریح سے حدیث کا مطلب پوری وضاحت کے ساتھ متعین ہو سکتا ہے۔ "غریب" کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب لکھتے ہیں:۔

وقیل لکل متناءٍ عن غریب ولکل شیءٍ بین جنسہ عدیم النظیر غریب

(مفردات القرآن ص ۳۶۷)

(اپنے گھر یا وطن سے) دور رہنے والے کو غریب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز اپنی نوع یا جنس کے لحاظ سے بے نظیر اور لاثانی ہو اس پر بھی غریب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ہماری زبان میں بھی اسی مناسبت سے ایسی چیز کو عجیب و غریب کہا جاتا ہے۔ لغت حدیث میں اس روایت کی تشریح اس طرح ملتی ہے "اسلام غربت سے شروع ہوا۔ جیسے غریب مسافر اپنے اہل و عیال اور وطن سے دور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے، اسی طرح اسلام بھی ابتداء میں غریب اور تنہا تھا، کوئی اس کا غمخوار نہ تھا یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ میں وہ پھر "غریب" ہو جائے گا۔ کفار، ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی، سچے، موحد اور دیندار متقی افراد کم رہ جائیں گے۔ ان غرباء کے لیے طوبیٰ یعنی بہشت ہے۔" (انوار اللغۃ- بحوالہ نہایہ ابن الاثیر و مجمع البحار)

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے ... کہ جن کلمات کا مادہ غ، ر، ب ہے وہ غائب ہونے، دور ہونے، یا انوکھے اور نامانوس ہونے کے مفہوم میں مشترک ہیں۔ مسافر کو عربی زبان میں غریب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر سے دور اور اپنے اس نئے ماحول میں اجنبی اور غیر مانوس ہوتا ہے۔ اردو میں مفلس آدمی کو غریب اسی لیے

کہا جاتا ہے کہ آج کل کے مادہ پرست ماحول میں ایسا شخص گمنام اور غیر معروف ہی رہتا ہے۔

غُراب (کوّے) کو غُراب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بلند پروازی اور آبادی سے دور ہو جانے میں، ضرب المثل ہے۔ اونٹ کے کوہان کو "غارب" کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اپنی انتہائی بلندی کی بنا پر دسترس سے دور ہوتا ہے، وہاں تک رسائی بمشکل ہی ہوتی ہے۔

تلوار کی دھار کو "غرب" کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ مضروب یا مقتول میں غائب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سونے کو بھی "غرب" کہا جاتا ہے کیونکہ زمینی معدنیات اور جواہرات میں وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

"غریب" کی تشریح حدیث میں مُسند احمد کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا طُوبیٰ للغرباء مبارکبادی ہے "غرباء" کے لیے۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا من الغرباء، غرباء کون ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا الذین یزیدون اذا نقص الناس یعنی جب عام لوگوں میں کمی آئے گی تو ان میں اضافہ ہوگا۔ حافظ ابن قیم رح لکھتے ہیں حدیث کے ان الفاظ کو وہم راوی سے اگر محفوظ مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا، الذین یزیدون خیراً وایماناً وتقیً، اذا نقص الناس من ذالک، یعنی غرباء وہ لوگ ہیں کہ جب عام لوگ ایمان تقویٰ اور نیک عملی کے اعتبار سے کم ہوتے جائیں گے تو یہ غرباء ان اوصاف کے لحاظ سے ترقی اور زیادتی سے ہمکنار ہوں گے، اگر وہم راوی کا احتمال درست مانا جائے تو اصل الفاظ یہ ہوں گے، الذین ینقصون اذا ازداد الناس یعنی جب عام لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا تو یہ کم ہو جائیں گے۔ (مدارج السالکین ج ۳ صـ ۱۹۳)

عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں غرباء کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا اَلنُّزّاعُ من القبائل یعنی مختلف قبائل سے علیحدہ ہونے والے مہاجر بے سہارا افراد۔

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ آپ نے غرباء کی تشریح میں فرمایا ناس صالحون قلیل فی ناس کثیر، من یعصیہم اکثر ممن یطیعہم (لوگوں کی بہت زیادہ تعداد میں قلیل افراد پر مشتمل صالح گروہ، ان سے سرتابی کرنے والوں کی تعداد ان کا کہا ماننے والوں سے زیادہ ہوگی۔)

ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا، الغرباء الذین یُحیونَ سنتی ویعلمونہا الناس غرباء وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے (مسند احمد)

ان تمام تفصیلات سے لغتِ عرب اور حدیث نبویؐ کی روشنی میں غریب کا مفہوم پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا ہے۔

غربتِ اسلام کا مفہوم اسلام کی غربت کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام اپنے ابتدائی دور میں ایک اجنبی اور نامانوس پیغام محسوس ہوا۔ اس کی دعوتِ توحید سن کر کہنے والوں نے کہا:۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ .... مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص - ۵، ۷)

کیا اس نے کئی معبودوں کی جگہ ایک معبود ٹھہرا لیا ہے، یہ ایک عجیب بات ہے۔ ایسی آواز ہم نے کسی دوسرے مذہب میں نہیں سنی۔ یہ صرف ایک گھڑی ہوئی بات ہے۔

اسی طرح جب لوگوں نے دیکھا کہ ایک انسان نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھا ہے۔ اور پوری انسانیت کو ابدی زندگی کی طرف بلا رہا ہے۔ تو انھوں نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا:

مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ، لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا (الفرقان ۷، ۸)

اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا کہ وہ اس کے ہمراہ ہو کر (لوگوں کے لیے) نذیر (ڈرانے والا) بنتا، یا اس پر خزانہ کیوں نہ نازل کیا گیا، یا اس کے لیے باغ ہی ہوتا جس سے وہ کھاتا پیتا۔

مشرکین کے نزدیک انسانیت اتنی حقیر اور گھٹیا مخلوق تھی کہ انسانوں میں سے کسی رسول کا برپا ہونا ان کے نزدیک انتہائی اچنبھے کی بات تھی۔ پھر انسان بھی ایسا جو ان کے معیار کے لحاظ سے فروتر، نہ اس کے پاس خزانہ اور نہ مال و دولت کے انبار۔

ان کی اسی حیرت اور تعجب کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:۔

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ (ق، ۲)

یعنی (قرآن مجید پر ایمان لانے کے بجائے) انھوں نے اسی پر حیرت کا اظہار کیا کہ ایک ڈرانے والا انہی میں آیا ہے، اور کافروں نے کہا یہ تو عجیب و غریب بات ہے۔

زندگی بعد موت کا عقیدہ بھی ان کے نزدیک ایک انوکھا اور نرالا عقیدہ تھا۔ ان کی اس حیرت و استعجاب کو قرآن نے متعدد مقامات پر نقل کیا ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ، ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ

(ق ۳)

کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی کا ڈھیر بن جائیں گے کیا ہم اس وقت دوبارہ زندہ کیے جائیں گے ؟ یہ ایک ناممکن بات ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید نے توحید، رسالت اور آخرت ان تینوں اساسی عقائد کو بار بار پیش کیا ہے اور ان کے ثبوت میں نہایت ٹھوس عقلی دلائل فراہم کیے ہیں، لیکن یہ تینوں بنیادی عقائد اسلام کے ابتدائی دور میں بالکل اجنبی اور نامانوس محسوس ہوتے تھے، اسی ماحول میں اس قسم کی صدا بلند کرنے والے کو "مجنون" سے کم کوئی لقب نہ تھا۔

اسلام نے اعلان کیا کہ خدا کو الٰہ، مالک اور رب ماننے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنی پوری زندگی، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی بغیر کسی استثنا اور شرط کے اس کے حوالے کردو۔ یہ اعلان اس معاشرہ میں کیا گیا، جہاں مذہب ایک انفرادی اور پرائیویٹ معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر انوکھی اور عجیب و غریب بات اور کیا ہوگی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

(بقرہ ۲۰۸)

ایمان والو! سلامتی اور صلح و آشتی والے دین (اسلام) میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی مت کرو۔

اُس ماحول میں جب کہ قبائلی امتیاز اور نسلی عصبیت نے انسان اور انسان کے درمیان بغض و عناد کی دیواریں حائل کردی تھیں اسلام نے باہمی محبت و اخوت کی بنیاد خدا پرستی اور نیک عملی کو قرار دیا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(حجرات ۱۰)

بس مومنین (آپس میں) بھائی بھائی ہیں تو دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ سرمایہ پرستی، مال و دولت کی اندھی محبت اور غریبوں کا خون چوسنے کا ایسا چسکہ پڑ گیا تھا کہ خرید و فروخت اور سودی لین دین کا فرق بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بس بیع سود ہی کی طرح تو ہے) بقرہ ۲۷۵

قرآن نے اس کے جواب میں اعلان کیا،

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

(بقرہ ۲۷۵)

اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے (دونوں یکساں کیسے ہوسکتے ہیں ؟)

اس دور کے معاشی میدان میں یہ آواز نئی اور نرالی تھی جس زمانہ میں زنا بدکاری کا عام رواج تھا، بے حیائی، بے غیرتی اور فواحش کا سیلاب امڈ آیا تھا، بے شرمی کی انتہا یہ تھی کہ برہنہ حالت میں کعبہ کا طواف کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔ قرآن نے عفت و عصمت کا درس دیا، اور الحیاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الايمان (یعنی حیاء اور شرم ایمان ہی کی ایک شاخ ہے) کا اعلان کیا، اور لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى فرما کر بدکاری کے دروازوں کھڑکیوں، روشن دانوں پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔

یہ طرز عمل اُس دور اباحت میں انتہائی حیرت انگیز اور عجیب و غریب تھا۔

جس دور میں کہ شخصیت پرستی اور شخصی استبداد نے لوگوں کے ذہنوں کو غلام بنالیا تھا۔ غور و فکر اور آزادانہ تنقید و احتساب کی صلاحیتیں مفلوج کردی تھیں، قرآن نے ہادیٔ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرو۔ اجتماعی معاملات کو صحیح اور پرامن طریقے پر طے کرنے کے لیے یہ اصول بھی بتادیا، وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ یعنی مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس ملوکیت پسند اور استبدادی دور میں اس قسم کے اجتماعی ضابطہ کا اظہار وقت کے ظالمانہ نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت سے کم نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہ تھا جس کو اُس دور کا معاشرہ بآسانی قبول کرسکتا ہو۔ اس کی ہر ہدایت انوکھی اور اس کا ہر پیغام اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اس موقع پر جن سعادت مند ہستیوں نے ثابت قدمی دکھائی اور "با زمانہ ستیز" پر عمل کرتے ہوئے جنھوں نے دریا کی موجوں کا رخ موڑ دیا۔

حقیقت میں ہر قسم کی مبارکبادیاں اور بشارتیں انہی باہمت افراد کو زیب دیتی ہیں۔ قرآن نے ان کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (توبہ ۱۰۰)

مہاجرین اور انصار میں سے سبقت لے جانے والے اور جنہوں نے احسان (اخلاص) کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

یہ ناسازگار دور جس میں اسلام کو اجنبیت اور نفرت و عداوت کا سامنا کرنا پڑا، پھر لوٹ کر آئے گا۔ ایک بار نہیں، نہ معلوم کتنی بار اس قسم کی اجنبیت سے سابقہ پیش آئے اور کشمکش کی صورت رونما ہو۔ اسلام غیروں کے ہاتھوں نہیں اپنوں ہی کی کرم فرمائیوں سے اپنے ہی دیس میں پردیسی بن کر رہ جائے ؎

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام و ایمان

ان حالات میں جو اللہ کے بندے فتنوں کا سر کچلنے اور دین اسلام کو غالب کرنے کے لیے اٹھیں، خدا کی طرف سے ہر قسم کی مبارکبادیاں اور بشارتیں انہی کے لیے ہیں۔ زیر بحث حدیث میں اسلام کی اسی غربت کا ذکر ہے۔ ذیل کی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ۔ (ہود ۱۱۶)

پھر کیوں نہ ہوئے ایسے باہمت لوگ پہلی قوموں میں جو زمین میں فساد کرنے سے مفسدوں کو روکتے، ہاں ایسے لوگ قلیل تعداد میں تھے جن کو ہم نے نجات دی۔

غربت اسلام اور زمانہ کی ناسازگاریوں کا نقشہ حسب ذیل روایت میں کتنے دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے:-

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

یأتی علی الناس زمانٌ الصابر فیھم علی دینہ کالقابض علی الجمر

لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ دین پر ثابت قدمی ہاتھ پر انگارہ رکھنے کے ہم معنی ہوگی۔

مشکوٰۃ باب تغیر الناس صفحہ ۴۵۹ (بحوالہ ترمذی)

(باقی آئندہ)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

سلطنت اسرائیل اور یہود سے متعلق قرآن کی پیشین گوئی

سوال: باوجود اس کے کہ یہودیوں کو قرآن میں ملعون و مغضوب قرار دے دیا گیا ہے اور کہہ دیا گیا ہے کہ یہ جہاں کہیں بھی ہوں، ان پر ذلت کی مار ہے۔ قرآن کے اس فرمان کی صداقت مسلم مگر ذرا سی کھٹک یہ پیدا ہوتی ہے کہ یہ غالب کیوں آ گئے اور فلسطین کی ریاست کے قیام کی بنا پر عرب و عجم پر ان کا سکہ کیوں چلنے لگا کہ آج پورا عرب شاید ہی ان کے مقابلے میں آ سکے۔

آل عمران کی آیات ۱۱۱ اور ۱۱۲ میرے پیش نظر ہیں۔ یہاں یہ فقرہ بھی موجود ہے "ان پر محتاجی و مفلوکی مسلط کر دی گئی ہے"۔

اس کے ساتھ ہی دور نبوی میں دیار عرب سے ذلت کے ساتھ نکلنے کے وقت سے آج تک کی ان کی نہایت اجمالی تاریخ بلکہ اشارے فرما دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

جواب:- قرآن مجید میں یہود کے متعلق کوئی پیشین گوئی ایسی نہیں کی گئی ہے جس کی بعد کے حالات و واقعات سے تردید ہوتی ہو بلکہ لوگ عام طور پر اپنے ذہن میں کوئی مفروضہ قائم کرتے ہیں اور پھر اس مفروضہ کی روشنی میں حالات کو دیکھتے ہیں اور جب حالات اور اپنے ذہنی مفروضہ میں مطابقت نہیں پیدا کر پاتے تو شبہات میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جب قرآن میں پیشین گوئی اس طرح کی گئی تھی تو واقعات و حالات اس کے خلاف کیوں جا رہے ہیں؟ حالانکہ اختلاف اگر ہوگا تو ان کے ذہنی مفروضہ اور واقعات میں ہوگا نہ کہ قرآن مجید میں اور تاریخ سے ثابت شدہ حالات میں۔ آپ نے آل عمران کی جس آیت کی بنا پر سوال کیا ہے وہ آیت قرآن مجید میں اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ

اگر اہل کتاب (بنی اسرائیل) ایمان لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ مومن ہیں اور اکثر فاسق

لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ۝ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۔ ۝

(۱۱۰ ۔ ۱۱۵ ۔ آل عمران)

ہیں۔ یہ تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر یہ کہ زبان درازی کر لیں۔ اور اگر یہ تم سے جنگ کے لیے نکلیں گے تو تمہیں پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد کرنے والا نہ نکلے گا۔ یہ جہاں کہیں بھی ہیں ان پر ذلت کی مار ہے مگر اللہ کے ذمہ کے تحت یا لوگوں کے کسی معاہدہ کے تحت۔ یہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور یہ جسارت انھوں نے اس سبب سے کی کہ انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور یہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔ سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ یہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہیں۔ یہ لوگ صالحین میں سے ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے، اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔

اس پورے سلسلہ کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آپ زیر بحث سوال پر غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گی کہ یہاں یہود کا وہ اخلاقی اور سیاسی زوال بیان ہو رہا ہے جس میں وہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ان یہود کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے مقابل میں نہیں آ سکتے۔ اور اگر آئیں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں

اور ان کی ہمتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ ان کی مسلسل بدعملیوں کے سبب سے ان پر ذلت اور پست ہمتی کی موت طاری ہو چکی ہے۔ اب اگر یہ کہیں کھڑے نظر آ رہے ہیں تو اپنے بل بوتے پر نہیں کھڑے ہیں بلکہ یا تو اللہ کے ذمہ نے ان کو امان اور پناہ دے رکھی ہے یا لوگوں کے ساتھ کسی معاہدے کا انھوں نے سہارا حاصل کر رکھا ہے۔

غور کیجیے کہ قرآن مجید نے ان کے بارے میں یہ جو باتیں فرمائی تھیں وہ حرف حرف کس طرح پوری ہوئیں۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے مقابل میں کھلم کھلا میدان جنگ میں آنے کی جرأت کبھی نہ کر سکے۔ اور اگر کسی پردہ کبھی آئے بھی تو انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ ان کے جو قبائل مدینہ کے قرب وجوار میں آباد تھے ان کو یکے بعد دیگرے نہایت ذلت کے ساتھ اپنی بستیاں خالی کرنی پڑیں۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ان کو اپنے دور خلافت میں یک قلم جزیرہ عرب ہی سے جلا وطن کر دیا اور اس کے بعد جہاں بھی ان کو امان ملی یا تو اسلام کے ذمیوں کی حیثیت سے امان ملی، یا پڑوسیوں کے رحم وکرم پر انھیں زندگی کے دن گذارنے پڑے۔ کہیں بھی ان کی یہ حیثیت نہیں باقی رہی کہ وہ ایک آزاد اور باعزت قوم کی حیثیت سے اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کر سکیں ـــ مذکورہ بالا آیات کے الفاظ پر اچھی طرح غور کر کے بتایئے کہ ان میں کون سا لفظ ایسا ہے جس کی صداقت بعد کے واقعات نے ثابت نہ کر دی ہو؟

مذکورہ بالا پیشین گوئی کے علاوہ یہود کے بارے میں ایک اور پیشین گوئی سورہ اعراف میں ان الفاظ میں وارد ہے:-

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۔ (۱۶۷ ۔ اعراف)

اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ ان کے اوپر قیامت تک اللہ ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو برے عذاب چکھائیں گے۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا ہے اور وہ غفور رحیم ہے۔

یہ پیشین گوئی جس بات کی خبر دیتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو قیامت تک برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔ اس میں اس بات کی نفی نہیں ہے کہ بیچ بیچ میں ان کو وقفے اور مہلتیں نہیں ملتے رہیں گے بلکہ آیت کے آخری الفاظ ان ربک لسریع العقاب و انہ لغفور رحیم سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ خدا ان کی سرکشیوں پر ان کو سزا بھی بھرپور دے گا اور ان کو اپنے قانون کے مطابق مہلتیں بھی عطا فرمائے گا۔

چنانچہ یہود کی تاریخ اور بائبل ہسٹری کا مطالعہ کیجئے تو آپ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ یہود کی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گذرا ہے جس میں انھوں نے اپنی سرکشی کی پاداش میں سوء عذاب کا مزا نہ چکھا ہو۔ میرے لیے ان کی تاریخ کے اس طرح کے سارے واقعات کا حوالہ دینا اس مختصر جواب میں ممکن نہیں ہے۔ میں صرف ان چند واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جو یہود کے لیے قومی اور اجتماعی عذاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ سب سے پہلے مصر میں فرعونیوں کے ہاتھوں پامال ہوئے۔ پھر بخت نصر (مشہور بخت نصر) کے ہاتھوں ان کی پوری قوم کو اسیری اور غلامی کی ذلت نصیب ہوئی۔ پھر ٹیٹس رومی نے ان کو تاراج کیا۔ پھر عیسائیوں کے ہاتھوں ان کو ذلتیں نصیب ہوئیں۔ پھر مسلمانوں نے ان کو ذمی بنایا۔ اب اسی دور آخر میں ہٹلر نے ان کو سوء عذاب کا مزا چکھایا۔

اس مسلسل عذاب کے دوران میں ان کو مہلت کے وقفے بھی، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، برابر ملتے رہے ہیں اور ان وقفوں میں یہ زور و قوت بھی حاصل کر لیتے رہے ہیں لیکن یہ زور و دبدبہ جب ان کے مزاج میں فساد پیدا کر دیتا تو اللہ تعالیٰ پھر ان پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتا جو ان کا سر غرور کچل کے رکھ دیتے۔ سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں یہ بات بڑی وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ براہِ کرم اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ کیا فلسطین میں یہود کی ایک سلطنت قائم ہو جانے سے قرآن کے ان بیانات کی کسی نوعیت سے تردید ہوئی ہے جو اس نے آل عمران اور اعراف کی مذکورہ آیتوں میں دیئے ہیں؟

آل عمران کی آیت سے متعلق ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کا کوئی تعلق بھی مستقبل سے نہیں ہے بلکہ صرف حاضر سے ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو مستقبل سے متعلق کرنے پر اصرار ہی کرے تو اسے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس میں یہود کے لیے جس ذلت و مسکنت کی خبر دی گئی ہے اس میں الا بحبل من اللہ و حبل من الناس کا ایک استثناء بھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی کسی امان کے تحت یا کسی قوم کے ساتھ معاہدے کے تحت ان کو وقتی طور پر اس ذلت سے مہلت بھی مل سکتی ہے۔ چنانچہ سلطنت اسرائیل ہمارے نزدیک اسی طرح کی ایک عارضی مہلت کا مولود فساد ہے جو برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ یہود کے ناجائز رشتہ سے ظہور میں آیا ہے۔ اس کو یہود کی اپنی کمر کے زور کا نتیجہ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ اسرائیل کی تاریخ

سے ناواقف ہیں۔ اس کا ظہور بھی برطانیہ اور امریکہ کی سازش سے ہوا ہے اور اس کا قیام بھی ابھی تک امریکہ اور برطانیہ ہی کے رحم و کرم پر ہے۔

اسی طرح اعراف کی آیت میں جو پیشین گوئی ہے اس کے متعلق ہم واضح کر چکے ہیں کہ مختلف عذابوں کے بیچ بیچ میں یہود کو کوئی مہلت مل جانا اس کے منافی نہیں ہے۔ اس طرح کی مہلتیں انھیں پچھلے عذابوں کے بعد بھی مل چکی ہیں اور اسی طرح کی ایک مہلت اب بھی انھیں ملی ہے۔ بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ یہود کے صحیفوں میں اس امر کی پیشین گوئی موجود ہے کہ ایک طویل انتشار اور ابتری کے بعد یہود آخری دور میں ارض مقدس میں پھر جمع ہوں گے تو میں اس خیال کی تردید نہیں کرتا۔ قدیم صحیفوں کے بعض اشارات کو اس مفہوم میں لیا جا سکتا ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہیؒ بھی فرماتے تھے کہ اس قسم کے اشارات صحف قدیم ہی موجود ہیں بلکہ وہ تو سورہ بنی اسرائیل کی آیت وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۱۰۴ (اور ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اس سرزمین پر رہو، پس جب آخری بار وعدہ ظہور میں آئے گا تو ہم تم کو جمع کریں گے گروہ در گروہ) کی تاویل اسی سورہ کی شروع کی آیتوں کی روشنی میں کرتے تھے اور اس سے یہ اشارہ نکالتے تھے کہ یہود انتشار اور ابتری کے بعد آخری دور میں ایک مرتبہ ارض مقدس میں پھر مجتمع ہوں گے لیکن ساتھ ہی انہی آیات کی روشنی میں ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس اجتماع کے بعد ان کی طرف سے جو سرکشی ظہور میں آئے گی اس کے نتیجہ میں ان کے اوپر خدا کا آخری عذاب نازل ہوگا جو ان کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

آخر میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ مسلمانوں کو اس طرح کی پیشین گوئیوں پر قومی نخوت سے ہمیشہ اپنے ذہن کو پاک کر کے غور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی قوم سے اس کے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے نہ نفرت ہے، نہ محبت۔ اس کی نفرت و محبت قوموں سے ہمیشہ ان کے اعمال کی بنا پر ہوا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس قوم کو خدا نے مسلمانوں کے ہاتھوں جلا وطن کرایا تھا، اسی قوم کو عین مسلمانوں کے وسط میں دوبارہ اس لیے مجتمع کر دیا ہو کہ مسلمانوں کو تنبیہ ہو کہ اب ان کی نالائقی اس حد کو پہنچ چکی ہے، کہ خدا نے ان کو ایک مغضوب قوم کے فتنوں کا نشانہ بنا دیا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس تنبیہ سے فائدہ اٹھایا تو انشاء اللہ سلطنت اسرائیل کا آخری قلع قمع مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوگا۔

سورۂ روم کی ایک آیت کی تاویل

سوال: سورہ روم کی آیت وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس الخ کی تفسیر کے سلسلے میں میرے لیے عجیب الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ آزادانہ غور و فکر سے جس نتیجہ پر پہنچا تھا، مفسرین نے اس سے بالکل جداگانہ صورت پیش کی۔ میرے نزدیک اس آیت میں ان اہل مال کی طرف اشارہ تھا جو تجارتی مقاصد کے لیے لوگوں کو قرض دیتے تھے اور اس گمان کا شکار تھے کہ یہ مال جسے وہ سود پر قرض دے رہے ہیں دوسرے شخص کے ہاتھوں کاروبار میں لگ کر ان کے ترقی مال کا موجب ہوگا۔

اس سے بالکل ہٹ کر مفسرین مثلاً طبری، سیوطی، آلوسی وغیرہ نے یہ آیۃ عطایا اور ہدایا کے سلسلے میں بیان کی ہے۔ اس آیۃ کی تفسیر میں عبداللہ یوسف علی اور شاہ عبدالحق نے زیادہ وسعت سے کام لیا ہے اور میں اس کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔

اگر سیاق و سباق سے ان آیات کو وابستہ کر دیا جائے اور لفظی معنی اور مفہوم نہ لیے جائیں تو پھر یقیناً ان تفاسیر کو حرف آخر ماننا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں چند سوالات ہیں جن کے بارے میں آپ کے خیالات سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔

۱۔ اگر یہ آیت صرف ہدایا اور عطایا تک محدود ہے تو پھر آتیتم من ربا کا لفظ کیوں آیا ہے۔ عطیوں کی ربا سے کیا تخصیص ہے؟

۲۔ اگر اس کو ایسا ہدیہ یا عطیہ ہی تسلیم کر لیا جائے جو کچھ اضافہ کے ساتھ پھر واپس آجائے تو پھر لیربوا فی اموال الناس کا گمان قرض دینے والا کس طرح کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے جو تحفہ کسی شخص کو ناقابل واپسی سمجھ کر دیا جائے اس کے متعلق تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس مال سے عطیہ یا ہدیہ پانے والے کے مال میں اضافہ ہوگا لیکن اگر اس کی واپسی کی اور وہ بھی اس سے زیادہ واپسی کی توقع ہے تو وہ در اصل قبول کرنے والے کے مال میں مزید کمی کا موجب ہوگا اور ایسی صورت میں ہدیہ دینے والا خود بھی لیربوا فی اموال الناس کے برعکس توقع رکھے گا۔

۳۔ اور اگر اس لیربو سے مراد ہدیہ دینے والے کے مال میں اضافہ ہے تو پھر آیت میں

فی اموالکم کے بجائے فی اموال الناس کیوں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ فی اموال الناس سے مراد وہی لوگ ہوں گے جن کو مال دیا گیا ہوگا۔ اور جن کے پاس اس مال کے پہنچنے سے اضافہ ہوا ہوگا۔ اگر یہاں لیربوا فی اموال الناس کی جگہ لیربوا من اموال الناس ہوتا تو بھی بات سمجھ میں آجاتی۔ ہمارے بعض مفسرین نے وما آتیتم کو وما اوتیتم قرأت کیا ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے آئمہ مفسرین اصل "نکتہ" نہ پا سکے۔ قرآن پر نظر کا دعویٰ تو کجا عربی ادب میں بھی میری معلومات واجبی سی ہیں۔ یہاں میری مراد اس پر زور دینا ہے کہ اس آیۃ میں صرف "تحریض علی زکوٰۃ" ہی نہیں ہے بلکہ سیاق و سباق سے ہٹ کر اس کے ایک عمومی معنی بھی ہیں، یعنی ربا[؎] RENTES میں سے تم جو رقم دیتے ہو، اس گمان پر کہ اس رقم سے (کاروبار کے ذریعے) لوگوں کے مال میں اضافہ ہوگا۔ سو اللہ کے نزدیک اضافہ (تمہاری دی ہوئی) اس رقم میں نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک مال پانے والے کے مال میں اضافہ کا گمان اس وقت تک محل نظر ہے۔ جب تک یہ مال کاروبار کرنے کے لیے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

جواب:۔ آپ کے اس سوال نے مذکورہ آیت کی تاویل کے بارے میں خود مجھے بھی بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ گمان بھی نہیں گذرا تھا کہ اس آیت میں لفظ ربوا سے مراد وہ عطیے اور ہدیے ہیں جو اس توقع پر لوگوں کو دیئے جائیں کہ وہ زیادہ ہو کر واپس ملیں۔ آپ کے مراسلہ کے بعد میں نے تفسیر کی کتابیں دیکھیں تو فی الواقع اہل تاویل سے اس مضمون کے اقوال نقل ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر یہ آیت ہدیوں اور عطیوں سے متعلق ہے تو اس پر وہ تمام شبہات وارد ہوتے ہیں جو آپ نے وارد کیے ہیں بلکہ ان کے علاوہ بعض اور شبہات بھی وارد ہوتے ہیں جو آپ نے وارد نہیں کیے ہیں۔

میں اس آیت کا جو مطلب روز اول سے سمجھا ہوں اور اب مزید غور و فکر سے جس پر بالکل پختہ ہو گیا ہوں وہ عرض کرتا ہوں۔ پہلے آیت اور اس کا سیدھا سادا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ	پس قرابت مند کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا

؎ یہاں ربوا کا ترجمہ RENTES جان بوجھ کر کیا ہے، یعنی وہ فنڈ جو سودی قرضوں کے لیے استعمال کیا جائے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ ۳۸ - ۳۹ - روم

چاہتے ہیں۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو قرض تم سود کے لیے دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال کے اندر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے تو یہی لوگ اللہ کے یہاں بڑھانے والے ہیں۔

آیت میں لفظ ربا استعمال ہوا ہے جس سے مراد میرے نزدیک وہ مال یا قرض ہے جو سود حاصل کرنے کے لیے دیا جائے۔ یہ لفظ کا استعمال اسی اسلوب پر ہے جس کو تسمیۃ الشئی بما یئول الیہ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی کسی شے کی تعبیر ایسے نام سے کرنا جو وہ ہونے والی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے انی اعصر خمرا۔ اس میں انگور کو شراب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت زیر نظر میں اس مال یا قرض کو جو حصول سود کے مقصد سے کسی کو دیا جائے ربا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

لیربوفی اموال الناس کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سود حاصل کرنے کے لیے جو مال دیا جاتا ہے اس کی مثال اس سانڈ کی ہے جو اس لیے چھوڑا جاتا ہے کہ دوسروں کی چراگاہ میں چر کر وہ فربہ ہو۔ ایک تاجر جو جائز طریقہ پر تجارت کرتا ہے اس کا مال تو خود اپنی چراگاہ سے غذا اور فربہی حاصل کرتا ہے لیکن ایک سود خوار کا مال اس کے برعکس دوسروں کا خون چوس کر موٹا ہوتا ہے۔ ایک تاجر کا سرمایہ بازار کے سارے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتا ہے اور اس مقابلہ سے توانائی حاصل کرتا ہے لیکن ایک سود خوار کا سرمایہ خود تو ایک محفوظ کمین گاہ میں دبک کر بیٹھتا ہے البتہ دوسرا جب ہر قسم کی جوکھم برداشت کرکے کوئی شکار لاتا ہے تو وہ اس میں سے بے خل و غش اپنا حصہ بٹا لیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے جو لیربو فی اموال الناس کے الفاظ سے نکلتی ہے۔

آپ نے جو مفہوم لیا ہے اس کا ایک حصہ بجائے خود صحیح ہے اور وہ اس آیت کے عام مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن آپ کا یہ خیال میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ اس سے مراد وہ فنڈ ہے جو تجارتی سودی قرضوں کے لیے استعمال کیا جائے اور جس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اجتماعی دولت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ یہ مفہوم لینے میں آپ پر وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو آپ نے مفسرین پر ربا سے ہدیہ یا عطیہ مراد لینے پر وارد کیا ہے۔ آخر ربا کے لفظ سے وہ فنڈ مراد لینے کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے جس سے تجارتی

اغراض کے لیے سودی قرض دیئے جائیں۔ پھر آپ کا مضمون تو جب بنتا ہے جب قرآن میں لیربوفی اموال الناس کے بجائے لیربی اموال الناس کے الفاظ ہوتے۔

اور آخر اس تکلف کی ضرورت کیا ہے جب کہ اس آیت کے الفاظ ہر قسم کے سودی قرض کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ کسی حاجت مند کو اس کی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیئے جائیں، یا تجارت کرکے نفع کمانے کے لیے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نزول قرآن کے وقت عربوں میں تجارتی اغراض کے لیے قرض لینے اور دینے کا رواج نہیں تھا، ان کا دعویٰ محض ایک احمقانہ دعویٰ ہے۔ اس زمانہ میں بھی عرب سرمایہ دار اور یہودی سیٹھ اور ساہوکار ہر قسم کے اغراض کے لیے قرضے دیتے تھے اور قرض لینے والے قرض لیتے تھے۔

• تدبر قرآن میں بعض مسامحات

سوال: گزشتہ پرچہ۔ جلد دوم شمارہ ۶ میں لاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق کے ترجمہ پر ایک نظر ڈال لیں ویسے مفہوم تو ٹھیک ہے کہ کتمان حق کے لیے ہی وہ لبس الحق بالباطل کی مختلف صورتیں اختیار کرتے لیکن ترجمہ میں دونوں ناہیہ جملوں کو الگ الگ ہونا چاہیئے یہ میری ایک گزارش ہے صرف نظر ڈال لیں۔

(۲) تفسیر میں ایک جگہ سورہ مائدہ کی آیت واذکروا نعمۃ اللہ (مائدہ - ۷) نقل ہوگئی ہے یہود کے سیاق و خطاب میں، حالانکہ اس کا خطاب اہل ایمان سے ہے۔

جواب: میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ان فروگذاشتوں پر تنبیہ فرمائی۔

جہاں تک لاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق کے ترجمہ کا تعلق ہے میں نے یہ چاہا تھا کہ جس طرح اصل میں حرف لا کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے ترجمہ میں بھی اس کا اعادہ نہ کروں لیکن اب آپ کے مشورے کے بعد میں نے اس پر دوبارہ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ عربی زبان کے اس اسلوب کو اردو میں بعینہٖ نباہنا مشکل ہے۔ اس وجہ سے بہتر یہی رہے گا کہ ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ "حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ"۔ انشاء اللہ اصل کتاب میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

(۲) دوسری فروگذاشت بھی بالکل واضح ہے، واذکروا نعمۃ اللہ ومیثاقہ الذی واثقکم

سے (۵، مائدہ) سے جہاں تک لفظ نعمت کے مفہوم کی وضاحت کا تعلق ہے، میں نے ٹھیک فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس آیت کو میں نے بنی اسرائیل سے متعلق جو قرار دے دیا ہے تو یہ چیز بالکل غلط ہے۔ قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ وہ جولائی ۱۹۶۰ء کے میثاق کے صفحہ ۱۳ میں "بنی اسرائیل" کے لفظ کی جگہ "مسلمانوں" کا لفظ کر دیں۔

غلطیوں کا تو انسان مجموعہ ہے، نہ معلوم کتنی غلطیاں ہوئی ہوں گی اور ہوتی رہیں گی لیکن ادھر بیمار ہوجانے کے سبب سے مجھ سے کچھ قصور خدمت بھی ہوا ہے۔ تفسیر کے مسودے پر، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، نظر ثانی نہیں ہو سکی تھی جس کے سبب سے بعض ایسی چیزیں نکل گئیں جو مجھے بھی کھٹکتی رہی ہیں۔ آئندہ کے لیے صرف احتیاط کا وعدہ ہے، غلطیوں سے بری تو انسان ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے یہاں طلب فرمائیں

مفردات القرآن	(قرآن کے مشکل الفاظ کی تحقیق)	ایک روپیہ چار آنے
اسباق النحو حصہ اول	(عربی گرامر جدید طریق پر)	ایک روپیہ
اسباق النحو حصہ دوم	"	بارہ آنے
تحفۃ الاعراب	(منظوم) "	چار آنے
امثال آصف الحکیم	(عربی ادب سیکھنے کی ابتدائی کتاب)	ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

(کتابیں بذریعہ وی پی طلب کریں یا ان کی قیمت مع محصول ڈاک پیشگی بھیج کر طلب فرمائیں۔ محصول ڈاک دس آنے)

اجتماعیات و سیاسیات

مولانا اسمٰعیل جلال الدین العمری

اسلام کا شورائی نظام[1]

اسلامی سیاست کا ایک اہم باب اس کا شورائی نظام ہے۔ سیاسیاتِ اسلامی کی معراج و تکمیل شورائیت کے بغیر ناممکن ہے۔ شورائی نظام کو خارج کر دینے کے بعد اسلامی سیاست ایک تنِ بے روح اور گلِ بے بو کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اسلام نے اپنی تمام تعلیمات کی طرح اس اہم پہلو کو بھی غیر مبہم اور صاف و صریح الفاظ میں واضح کر دیا تھا۔ جس کے بعد اس مسئلہ میں کسی ریب و تردد اور اختلاف کی گنجائش نہیں پیدا ہونی چاہیے تھی لیکن دورِ حاضر کی ژولیدہ فکری نے اس واضح اور روشن مسئلہ کو بھی پیچیدگی اور الجھاؤ میں ڈال دیا ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسئلہ کے تمام گوشوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تاکہ ایک عام آدمی کے ذہن میں کوئی ابہام اور غلط فہمی باقی نہ رہے اور حقیقت اپنی تمام جمال آرائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جائے۔

جو لوگ کسی بھی صورت سے اسلام میں شورائیت کو تسلیم کرتے ہیں ان کی تین ہی قسمیں ہو سکتی ہیں اور اس وقت ان تینوں ہی فکر و خیال کی مختلف طریقوں سے ترجمانی کی جا رہی ہے۔

۱۔ **امیر اور آمریت** ان میں سے ایک خیال تو یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا صدر اپنے اختیارات و تصرفات کے لحاظ سے قریب قریب ایک ڈکٹیٹر کے مقام پر متمکن ہو جاتا ہے، اسلام نے اس پر جو کچھ حدود و قیود عائد کیے ہیں وہ اس قدر ادھورے اور ناقص ہیں کہ صدرِ ریاست ہوا و ہوس کی اتباع میں ہر طرح کی بے عنوانیوں کے لیے راہ نکال لے سکتا ہے۔ اسلام صدرِ ریاست سے جو کچھ مطالبات کرتا ہے وہ بالاجمال یہ ہیں۔ امیر اساساتِ دین کی خلاف ورزی نہ کرے، "معروف" کو فروغ دے اور "منکر" کو ختم کرے، نیز مملکت کے کاموں میں

---

[1] یہ مضمون معزز معاصر زندگی رام پور کے صفحات سے میثاق میں نقل کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

اہل الرای حضرات سے مشورہ کرے، لیکن اسلام امیر ریاست کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند نہیں کرتا اگر امیر مملکت، ارباب شوریٰ سے بلا مشورہ کیے یا مشورہ کے بعد ان کے متفقہ فیصلہ کے علی الرغم کوئی اقدام کر جائے تو اسلام کے آئین سلطنت میں اس کے اس اقدام پر قدغن لگانے والی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے اور اگر وہ شوریٰ کے فیصلے کا خود کو پابند کرے تو یہ اس کا کرم و احسان ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی صدر حدود اسلامی کی پامالی کرنے لگتا ہے اور اس کی بنیادوں کو متزلزل بھی کرتا ہے تو افراد مملکت کے پاس صدر کو اس کی اس غلط روی سے باز رکھنے کا کوئی سامان نہیں ہے کیونکہ اسلام نے اصلاح کے ہر اقدام پر فتنہ کا خوف و ہراس پیدا کر کے عوام کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ جب عوام کو اپنے اختیارات سے عملاً بالکل اپاہج اور عضوِ معطل کر دیا جائے تو صدر سے اس کے اعمال کی باز پرس کون کر سکتا ہے۔

۲۔ امیر کا تعطل اس کے بالکل برعکس اور متضاد ایک دوسری رائے ہے جس کے لحاظ سے ریاست کے ہر جزئی و کلی معاملہ میں فیصلہ کن طاقت شوریٰ ہی کی ہے اور امیر شوریٰ کے مشورہ کا بالکلیہ پابند ہے۔ وہ شوریٰ کے فیصلوں سے سر مو تجاوز کرنے کا قطعاً مجاز نہیں ہے۔ اگر کسی وقت امیر اس قسم کا اقدام کر جائے تو شوریٰ کو اس کی برطرفی کا مکمل اختیار ہوگا۔

۳۔ امیر کی آزادی و پابندی اس سلسلہ کی تیسری رائے یہ ہے کہ امیر تمام اساسی امور میں نمائندگان قوم کی رائے کا پابند ہے اور اسے یہ حق نہیں ہے کہ ملک کے بنیادی اور فیصلہ کن معاملات کو ارباب حل و عقد سے مشورہ لیے بغیر طے کر دے۔ ان تمام معاملات میں جو ریاست کے اجتماعی مفاد پر اثر انداز ہو سکتے ہوں قوم کے نمائندوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر صدر ریاست قدم اٹھانے کا حق ہی نہیں رکھتا۔ اگر کوئی امیر اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ارباب بست و کشاد کو یہ حق ہے کہ وہ امیر کو معزول کر دیں۔ باقی رہے روزمرہ کے امور تو ان میں امیر کو مسائلِ متعلقہ میں بصیرت اور درک رکھنے والوں سے مشورہ کرنا چاہیے لیکن وہ ان مشیروں کی رائے کا پابند نہیں ہے۔ مختلف آراء میں سے کسی ایک رائے کے انتخاب اور اس پر عمل کا اسے حق ہے اور مشیروں کا یہ طبقہ ضروری نہیں ہے کہ قوم کے نمائندوں ہی پر مشتمل ہو بلکہ اس کے لیے صرف روزمرہ کے پیش آنے والے مسائل میں فہم و بصیرت سے بہرہ مند ہونا کافی ہے۔

یہی تیسری رائے ہماری دانست میں کتاب و سنت کے موافق اور اس سے قریب تر ہے اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کا ہر قول قطعی اور ہر فیصلہ محکم اور غیر متبدل ہے

اس کے ساتھ شارحِ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تشریحات کا مطالعہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کے نصوص کی اس سے زیادہ سچی اور صحیح تعبیر ممکن ہی نہیں اور یہی دو سرچشمے ہر اس شخص کی ہدایت کے ماخذ اور اس کے اختلافات کے حکم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی فرمانروائی پر کامل یقین رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں خالص تاریخی نقطۂ نظر سے اس امر کا بھی جائزہ لینا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے اجتماعی معاملات کو حل کرنے کی کیا صورت اختیار کی تھی۔ اگر کسی کی تعلیمات کی ایک سے زائد توجیہات ممکن ہیں لیکن اس کا عمل کسی ایک توجیہ کے حق میں مہر توثیق ثبت کر دیتا ہے تو پھر کسی کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ اس کے الفاظ و تعبیرات کو کوئی خود تراشیدہ جامہ پہنائے۔

اسلام کی عمومیت نفس مسئلہ کا اس کے حقیقی خدوخال میں مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک اہم حقیقت ذہن نشین کر لی جائے اور وہ ہے اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری، اس کی دعوت کے عموم میں نوعِ انسانی کا ہر وہ فرد شامل ہے جو اس فلکِ نیلگوں کے زیر سایہ رہتا بستا ہے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی پکار سے انحراف کرے کائناتِ ارضی و سماوی جس قدر وسیع ہے اسی قدر اسلام کی دعوت بھی وسیع ہے، کیونکہ یہ دعوت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص خطہ کی اصلاح و تربیت کے لیے نہیں شروع کی گئی تھی بلکہ کائنات کے خالق و مالک نے اسے اپنے تمام بندوں کی فلاح و کامرانی اور نجات کا ذریعہ بنایا ہے پس خدا کی قدرت اور اس کی حاکمیت جس قدر عام اور بے پایاں ہے اسی قدر اس کا نازل کردہ دین بھی وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔

خدا کے سب سے آخری رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے اس نے اعلان کیا تھا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

اے نبی تم کہہ دو کہ اے لوگو! یقیناً میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں وہ اللہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی ہے امی ہے اور جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کی باتوں پر

اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (الاعراف ع ۲۰)

اس کے ساتھ وہ اپنے ماننے والوں سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ انھوں نے جس دین کو اپنا دستور عمل اور ضابطۂ حیات تسلیم کیا ہے اسے زندگی کے تمام گوشوں میں نافذ کریں۔ مسائلِ حیات کے حل کے لیے سوائے اس کے کسی اور طرف نگاہ تک نہ اٹھائیں۔ یہی ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے اس کے خلاف جو بھی روش وہ اختیار کریں مبنی بر نفاق اور اسلام کے خلاف ہوگی۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (النور ع ۷)	مومنین کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان کا کہنا بس یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کا قلادہ جس نے بھی زیب گردن کر لیا، اس کا تعلق خدا اور رسول سے ہو جائے خواہ وہ کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، یہاں نہ پنڈتوں کے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ہے اور نہ کسی آمر کی آمریت عوام کی گردنوں میں اپنا آہنی پنجہ گاڑے ہوئے ہے بلکہ یہاں صرف ایک ہی حاکم کی حاکمیت اور ایک ہی فرمانروا کی فرمانروائی جاری و نافذ ہے اس کے علاوہ جو بھی فرمانروائی کسی خدا کے بندے پر نافذ کی جائے گی وہ جور و ستم اور ظلم و تعدی پر مبنی ہوگی۔ پس یہاں فرمانروائی اور حاکمیت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور علاوہ ہر اس شخص پر جاری ہوگی جو اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کرے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، عربی ہو یا عجمی، اس کا رنگ سرخ و سفید ہو کہ سیاہ، وہ اپنے کھیت میں ہل جوتتا ہو یا تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہو کیونکہ "خدائی اطاعت" ایک اصول اور ایک ضابطہ ہے اور یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ اصول کسی کی جاگیر نہیں ہوتے، ان پر کسی کی ٹھیکہ داری نہیں چلتی بلکہ ہر شخص کے لیے ان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ اصول کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک خانہ بدوش صحرائی یا آپ کے جوتے گانٹھنے والا ایک موچی بھی انھیں اپنائے تو اسے سرداران قوم کے دوش بدوش جگہ ملنی چاہیے اور اگر وہ اپنی فداکاریوں اور قربانیوں سے اصول کا سب سے زیادہ محافظ و پاسبان ثابت ہو اور میدان عمل میں دوسروں سے

پیش پیش ہو تو راہنمائی کا علم تھامنے سے بھی اس کی راہ میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔

اجتماعی امور اور امتِ مسلمہ

چونکہ اسلامی ریاست ایک شوریٰ اور جمہوری ریاست ہوتی ہے جو خالقِ ارض و سما کے نازل کردہ دین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لیے اجتماعی امور کے حل کرنے اور بنیادی معاملات کے فیصلہ کا حق کسی خاص فرد کے حوالہ کرنے کے بجائے ساری امت کے حوالہ کیا گیا ہے۔

اسلامی سیاست کا یہ اصول اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے خاص اہمیت اور پوری شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

سورۂ شوریٰ جو کہ ایک مکی سورت ہے اور جس میں خالص اصولی ہدایات کی تفصیل کی گئی ہے۔ اسی سورت میں ایک مقام پر ان مومنین صادقین کی مدح و توصیف کی گئی ہے جن کے لیے آخرت کی کامیابی مقدر ہو چکی ہے۔ سلسلۂ بیان میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ وہ صادق الایمان اور اعلیٰ کردار سے آراستہ افراد ہیں جو خدا کے رسول کی دعوت کو بدل و جان قبول کرتے اور اپنی ساری عملی توانائیوں کو اس کی اتباع میں لگا دیتے ہیں۔ اس وصفِ کلی کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں یعنی ان کا تعلق اپنے مولیٰ و آقا کے ساتھ حد درجہ پائیدار اور محکم ہوتا ہے۔ ان کی دوسری نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ:-

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ع ۴)	ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں

علامہ ابوبکر جصاص حنفیؒ فرماتے ہیں:-

"ایمان و اقامت صلوٰۃ کے ساتھ شوریٰ کا تذکرہ اس کی جلالتِ شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ امتِ مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابند ہے"[1]

قرآن کا ایک عام طرز یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ فوراً زکوٰۃ یا انفاق کا تذکرہ کرتا ہے اور اس سے مقصود حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ایک سی اہمیت اور ان کی غیر منفک حیثیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے لیکن سورۂ شوریٰ کی مذکور الصدر آیت میں انفاق سے پہلے شوریٰ کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ شوریٰ کے اصول کو نظر انداز کر دینے کے بعد حقوق العباد کا تحفظ ناممکن ہے اور کوئی ریاست اس جوہر کے بغیر عدل و انصاف کے پاسنگ کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ یہاں ایک اور حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ حکم شوریٰ کو جملۂ اسمیہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ مومنین کا یہ وصفِ امتیازی ایک دائمی وصف ہے جو کسی بھی حال میں ان سے

[1] احکام القرآن ج ۳ صفحہ ۵۶

منفک نہیں ہو سکتا، وہ کسی بھی وقت ایسا معاملہ طے نہیں کر سکتے جس میں باہمی مشورہ نہ کیا گیا ہو۔

امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"صحابہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے روبرو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعے اسے طے کرتے۔ اللہ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملہ پر ایک رائے نہیں ہو جاتے اقدام نہیں کرتے"[1]

احادیث ایک اور پہلو اس موقعہ پر ہمارے سامنے اجاگر کرتی ہیں وہ یہ کہ دنیا میں جتنی تباہیاں اور ہلاکتیں پیدا ہوتی ہیں ان سب کا سرچشمہ خواہشات نفس اور اس کے سفلی جذبات کا اتباع ہے جب کوئی فرد یا قوم نفس کی بندگی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے تو اس کا تباہی و بربادی سے ہمکنار ہونا ناگزیر ہے لیکن جس قوم کے رگ و ریشہ میں خدا کی غلامی اور خوفِ آخرت جاگزیں ہو اس کے بعض افراد اور بعض طبقوں کے بارے میں تو یہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہو جائیں گے لیکن پوری امت مسلمہ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی وقت وہ من حیث المجموع صداقت و راستی کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلَالَةٍ میری امت کبھی ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:-

"انفرادی رائے سے اجتماعی رائے جو باہمی مشورہ سے طے پائی ہو زیادہ نافع ہے اس لیے کہ ایک فرد کا جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو جانا عین ممکن ہے لیکن کسی جماعت کا مبتلائے ہوا و ہوس ہو جانا ناممکن ہے خصوصیت سے اعلیٰ مناصب اور شریعت کے بلند تر مراتب میں فرد کا ہوا و ہوس سے محفوظ رہنا دشوار تر ہے"[2]

ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تا قیامت میری امت میں ایک ایسا طبقہ ضرور رہے گا جو دین کو ہر طرح کی تحریف و تغیر سے محفوظ رکھے گا اور کسی فتنہ پرور کو فتنہ اندازی کا موقع نہ دے گا۔ ایک اور موقع پر آپ نے اسی طبقہ کو حامی دین اور اس کا مددگار قرار دیا ہے (بخاری مسلم)

یہ اور اس قسم کی بہت ساری حدیثیں ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ کسی بھی دور میں امت مسلمہ کی دینی روح اس حد تک سرد نہیں پڑ جائے گی کہ پوری امت باطل کو انگیز کرنے لگے۔ بلکہ کوئی نہ کوئی طبقہ

[1] تفسیر کبیر ج ، ص ۱۵/۲ [2] الاعتصام ج ۳ ص ۹۹

ایسا ضرور موجود ہوگا جو ہر طرح کی رخنہ اندازیوں اور فتنہ سامانیوں کے مقابلہ میں سد راہ بنا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے عوام کا کوئی گروہ یا جہلاء کی کوئی ٹولی مراد نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے ایسا ہی طبقہ مراد ہو سکتا ہے جس میں دین کی فہم و بصیرت ہو، جو دین کے دشمنوں کی چالوں سے بخوبی واقف ہو۔ جو باطل کے ہر سوانگ اور روپ کو سمجھ سکتا ہو، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام نے حکومت و تنقید کا حق کیوں ساری امت کے حوالے کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کے ماننے والوں میں کسی ایک فرد یا کسی ایک جماعت کا راہ صواب سے ہٹ جانا بہت ممکن ہے لیکن پوری امت کی امت باطل پرست ہو جائے، یہ ناممکن ہے۔

ترغیب شوریٰ ان بلند مقاصد کے پیش نظر اور جمہوریت کی اسپرٹ قائم رکھنے کے لیے شریعت نے پہلے ہی قدم پر انسان کے اندر باہمی مشورہ سے کام کرنے کا اشتیاق پیدا کیا ہے تاکہ دل کی گہرائیوں اور فکر و خیال کی پہنائیوں میں شورائیت کی روح جاری و ساری ہو جائے اور اس کے ہر کام میں اجتماعیت کی جلوہ گری ہوتی رہے اور انفرادیت و استبداد سے آدمی بالطبع نفرت کرنے لگے۔

اسلام جس اجتماعی زندگی کو پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے ماننے والوں میں جس قسم کے اتحاد و الفت کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ شوریٰ پر پورا زور صرف کرتا، اخوت و الفت اور محبت و مؤانست کے نازک ترین رشتہ پر جو چیز قینچی چلاتی ہے وہ آدمی کی انفرادیت اور استبداد ہے جب ایک آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرا اس کے حقوق کی پامالی کر رہا ہے اور اس کے "انا" اور خودداری کو مسل دینے کی سعی کر رہا ہے تو یکلخت اس کی رگ حمیت و غیرت جاگ اٹھتی ہے اور اپنے آپ سے اہانت و ذلت کا داغ دھونے کے لیے وہ ہر بندش کو پارہ پارہ کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب معاشرہ کے افراد کے درمیان یہ تصور عام ہو جائے کہ یہاں کسی کی کسی پر حکمرانی نہیں ہے یہاں شاہ و گدا، خادم و مخدوم راعی و رعیت سب ایک صف میں کھڑے ہیں اور یہ معاشرہ الفت و محبت کے پائندہ اصولوں پر استوار ہے اور ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام عملی جامہ نہیں پہن سکتا تو یہ یقینی ہے کہ فساد و بدامنی کا دروازہ از خود بند ہو جائے اور امت کا شیرازہ محکم سے محکم تر ہونے لگے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا اسی حقیقت کی روشنی میں مطالعہ کیجئے۔

رَأْسُ الْعَقْلِ بَعْدَ الْإِيمَانِ التَّوَدُّدُ إِلَى النَّاسِ وَمَا يَسْتَغْنِي رَجُلٌ عَنْ مَشْوَرَةٍ[1]

ایمان کے بعد سب سے بڑی عقلمندی لوگوں سے محبت ہے اور آدمی مشورہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۱۰۹

ایک اور موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کو اپنے لیے اچھے مشیر چننے کی ترغیب اور اس کے اچھے نتائج کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَالْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ[1]

اللہ تعالیٰ جب کوئی نبی بھیجتا ہے یا کسی کو خلیفہ بناتا ہے تو اس کے دو قسم کے رازدار ہوتے ہیں کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اسے بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور اس پر آمادہ کرتے ہیں اور کچھ برائی کا حکم دینے والے اور اس پر اکسانے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ جس کو ان بُرے مشیروں سے محفوظ رکھے اسی کو محفوظ سمجھنا چاہیے۔

●

شوریٰ کے بے شمار فوائد اور اس کے ناقابلِ تصور نتائج کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیل کے الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

اَلْمُشَاوَرَةُ حِصْنٌ مِنَ النَّدَامَةِ وَأَمَانٌ مِنَ الْمَلَامَةِ[2]

مشورہ کرنا شرمندگی سے محفوظ رہنے کا ایک قلعہ ہے اور ملامت سے بچنے کی ایک امان گاہ ہے

آپ کا ایک حکیمانہ قول ہے:۔

مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ[3]

وہ آدمی ناکام نہیں ہوا جس نے استخارہ کیا اور وہ شخص شرمندگی اٹھانی نہیں پڑی جس نے مشورے سے کام کیا۔

حضور اکرمؐ نے امت کو یہ تعلیم دی ہے:

اِسْتَعِينُوا عَلَى أُمُورِكُمْ بِالْمُشَاوَرَةِ[4]

اپنے کاموں میں باہمی مشورہ سے مدد حاصل کرو۔

امام ابوداؤد نے اپنی "مراسیل" میں روایت کی ہے کہ ایک شخص نے آں حضرتؐ سے دریافت کیا کہ "حزم" یعنی احتیاط اور مضبوطیٔ کار کسے کہتے ہیں آپؐ نے جواب دیا "اَنْ تُشَاوِرَ ذَا رَأْيٍ ثُمَّ تُطِيعَهُ" یہ کہ تم صاحب رائے سے مشورہ کرو اور اس کے مشورہ کی پابندی کرو[5]۔

---

۱ بخاری کتاب الاحکام باب بطانۃ الامام واہل مشورتہ، و دیگر کتب صحاح ۲ المدخل لابن الحاج المتوفی ۷۳۷ھ ج ۴ ص ۱۲۵ ۳ ایضاً ۴ ایضاً ص ۲۲۔

۵ بیہقی ج ۱۰ ص ۱۱۲

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، شوریٰ کے ذریعہ طے کردہ معاملات کے استحکام اور استواری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"ایک شخص کی رائے اکہرے اور کچے دھاگے کی سی ہے جب دو رائیں کسی مسئلہ پر جمع ہو جاتی ہیں تو ان کی حیثیت دو مضبوط دھاگوں کی سی ہو جاتی ہے جب کسی معاملہ میں تین رائیں متفق ہو جاتی ہیں تو وہ ناقابلِ شکست ہو جاتی ہیں[1]۔"

حضرت عمرؓ کا ایک اور ارشاد ہے:۔

"دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کے کام کرنے کے ڈھنگ بھی جُدا جُدا ہوتے ہیں ایک تو وہ شخص جو معاملات کا اپنی جیسی کچھ رائے ہوتی ہے اسی کے مطابق فیصلہ کر بیٹھتا ہے، دوسرا وہ شخص جو مشکلات میں مشورہ کرتا ہے اور اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق عمل کرتا ہے، تیسرا وہ شخص جو مشکلات میں حیران و سرگردان رہتا ہے نہ تو سیدھے طریقہ پر اپنے معاملہ کو حل کر سکتا ہے نہ کسی کی بات مان کر اس پر عمل کرتا ہے[2]۔" (ان میں سے کس کا عمل درستی پر ہے یہ از خود واضح ہے)

حضرت علیؓ کا ایک قول ہے:۔

"مشورہ آدمی کا بہترین معاون ہے، بری ہے وہ طاقت جس سے آدمی استبداد پر اتر آئے[3]۔"

حضرت علیؓ کا ایک دوسرا قول ہے:۔

اَلْاِسْتِشَارَةُ عَيْنُ الْهِدَايَةِ وَقَدْ خَاطَرَ مَنِ اسْتَغْنَى بِرَأْيِهِ

باہمی مشورہ سے کام کرنا ہی اصل ہدایت ہے وہ شخص خطرات میں گھر گیا جس نے اپنی رائے کے ساتھ انفرادیت اختیار کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے۔

"ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اور آپس میں علمی مذاکرہ کرنا خیر و برکت کی کلید اور رحمت کے دروازے ہیں کیونکہ ان دونوں کے اختیار کرنے کے بعد کسی رائے کے بھٹک جانے اور حزم و احتیاط کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہے[4]۔"

---

۱ عیون الاخبار ج ۱ ص ۳۱ ۔ ۲ المدخل لابن الحاج ج ۴ ص ۱۲۵ ۳ ایضاً

۴ ایضاً۔

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں :-

وَاللّٰهِ مَا اسْتَشَارَ قَوْمٌ قَطُّ اِلَّا هُدُوْا لِاَفْضَلِ مَا يَحْضُرُهُمْ ؎

قسم بخدا جب کوئی قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے، تو پیش آمدہ مسائل میں راہ صواب پالیتی ہے۔

شوریٰ کی قانونی حیثیت یہ ترغیبات و تشویقات خود اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ایک مومن والہانہ طور پہ اپنے اجتماعی معاملات کو باہمی مشورہ کے ذریعہ سرانجام دے اور انفرادیت کی لعنت سے بالکلیہ دامن کش رہے لیکن شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے قانونی گوشوں کو بھی بغیر کسی ابہام کے دنیا کے سامنے رکھ دیا اب ایک آنکھ رکھنے والا شخص اسلام کی ان آفتاب سے زیادہ واضح تصریحات کا انکار نہیں کر سکتا۔ الا یہ کہ کوئی اپنی آنکھیں ہی میچ لے۔

شورائی نظام کی قانونی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک منٹ کے لیے رک کر اس تشریح کو دوبارہ ملاحظہ فرمالیں جو آیت شوریٰ کے تحت کی گئی ہے۔ اس آیت نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ امت اپنے معاملات کا فیصلہ باہمی مشورہ کے ذریعہ طے کرے گی۔ ہمارے علم میں کتاب و سنت میں کوئی ایسی تصریح نہیں ملتی جسے ہم اس حکم صریح کی ناسخ قرار دیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی تعلیمات اور سیرت مورد ہو اسی اجمال کی تفصیل دکھائی دیتی ہے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ میں اعلان کیا۔

فَاِذَا رَاَيْتُمُوْنِیْ قَدِ اسْتَقَمْتُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔

جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرو اور اگر میں راہ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کرو۔

•

اس سے مسئلہ کی تمام الجھنیں صاف ہو گئیں اور یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام کی نگاہ میں اصل قوت عوام ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جب تک یہ محسوس کریں گے کہ ہمارا راہنما ہماری صحیح قیادت کر رہا ہے اس وقت تک اس کے دست و بازو بنے رہیں گے لیکن جس وقت ان کی آنکھیں دیکھنے لگیں گی کہ اب قیادت بجائے کعبہ کے ترکستان کی طرف لے جا رہا ہے اقتدار کی کنجیاں اس کے ہاتھ سے چھین لیں گے۔

یہ تصریح صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہیں کی ہے بلکہ اسی کے ہم معنی بیانات تمام خلفائے راشدین سے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔

شوریٰ کا دوسرا حکم سورۂ آل عمران میں نازل ہوا جو مدینہ منورہ میں جنگ احد کے بعد اتری تھی، اس آیت کی پوری پوری اہمیت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ نزول آیت کا پس منظر بھی سامنے رہے۔

جنگ احد کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ ہی میں رہ کر دشمن سے مقابلہ کرنے کی تھی لیکن جمہور صحابہ خارج مدینہ میدان کارزار میں مشرکین سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے، آپ نے حکم قرآنی کے مطابق جمہور کی رائے پر عمل کیا اور مدینہ سے میدان جنگ کی طرف نکل پڑے۔ بعد ازاں میدان احد میں گھمسان کا رن پڑا اور علم فتح و نصرت حق پرستوں کے ہاتھ میں رہا اندریں اثنا بعض جاں نثاروں کی غلط فہمی سے جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور جیتا ہوا میدان ہاتھ سے نکل گیا یہ ایسا نازک وقت تھا جب کہ بہت ممکن تھا کہ جمہور کی فکر و رائے کی عظمت کچھ فروتر ہو جاتی اور ان کی رائے اور مشورہ کی قدر و قیمت یک گونہ کم ہو جاتی فوراً ارشاد خداوندی نے توجہ دلائی۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

(آل عمران ۱۷ ع)

اے نبی انہیں معاف کیجئے اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیجیے اور ان سے معاملات میں مشورہ کرتے رہیے اور جب آپ (مشورہ کے بعد) کسی کام کا عزم کر لیں تو خدا پر توکل فرمایئے (اور اقدام فرمایئے)

•

اس آیت نے بتایا کہ گو جمہور نے غلطی کی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ ان کی رائے مبنی بر خطا ہی ہو جمہور امت ریاست کا سرمایہ اور جان ہیں انہیں نظر انداز کر کے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اگر کسی فرد نے استبداد سے کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ساری امت کو مصیبت اٹھانا پڑی تو یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی لیکن امت کا فیصلہ اگر غلط بھی نکلے تو اس کے لیے قابل برداشت ہوتا ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ساری قوم غلط راہ ہی کا تعین کرے۔

اس آیت کے مخاطب براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ظاہر ہے کہ نبی کے قلب و روح پر سرّان غیب کا فیضان ہوتا رہتا ہے اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی بھی وقت راہ راست سے (نعوذ باللہ) منحرف ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیوی معاملات میں بھی بیشتر مواقع پر آسمانی ہدایت جادۂ صواب کی طرف رہنمائی کرتی رہی اور زندگی کے نشیب و فراز میں کامیابی و ناکامی کے گر بتاتی رہی جہاں تک فکر انسانی کی رسائی ممکن نہیں لیکن اس کے باوجود چونکہ نبی کی ذات ایک قابل تقلید اسوہ اور واجب الاتباع راہنما کے

مقام پر فائز ہوتی ہے اس لیے حکمِ شوریٰ کی طرف دوبارہ توجہ دلائی گئی تاکہ آپ کے جانشین کسی بھی حال میں اس حکمِ نصی کو نظر انداز نہ کرنے پائیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے آیت زیرِ بحث کو اسی روشنی میں دیکھا ہے، فرماتے ہیں۔

"خدا کو معلوم تھا کہ نبی صحابہ کے مشورہ کا محتاج نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مشورہ کا حکم دیا گیا تاکہ امت اپنے معاملات کو اسی نہج پر چل کرے۔"[1]

قرآن کے مشہور قانون داں امام ابوبکر جصاص حنفیؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی اس حکم کو واجب مانتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"یہ بات صحیح نہیں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم محض تطییبِ نفوس یا صحابہ کے مراتب کو بلند کرنے یا سنتِ مشاورت قائم کرنے کے لیے دیا گیا ہو کیونکہ اگر صحابہ کو یہ بات معلوم ہوتی کہ مشورہ طلب معاملات میں اپنی بساط بھر کوشش کرنے کے باوجود ان کے مشورہ کو شرفِ قبولیت نہیں عطا کیا جائے گا۔ اور ان کے مشوروں کے مطابق عمل درآمد نہیں ہوگا تو اس میں ان کی رفعِ شان تو کیا ہوتی اس طرزِ عمل سے الٹا سخت متوحش ہوتے اور یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے کہ ہمارے مشوروں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے (اور یہ بات ان کی ذلت کی باعث بنتی)"[2]

علامہ سید محمود آلوسی البغدادیؒ کو امام ابوبکر جصاصؒ کے طرزِ استدلال سے اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں:-

"اگر مشورہ کا مقصد اربابِ شوریٰ کی آراء سے فائدہ اٹھانے کے بجائے محض دلجوئی ہوتا تو ہر کس و ناکس سے مشورہ لیا جا سکتا تھا خواہ وہ صاحبِ رائے ہو یا نہ ہو، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اہل الرائے سے مشورہ فرماتے تھے۔"[3]

بہرحال نبی کے حق میں اس مشورہ کی جو بھی حیثیت ہو امت پر اس حکم کے واجب ہونے سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ علامہ ابوحیان اندلسیؒ اس حکم کا منشا واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وَلِتَشْرِيعِ الْمُشَاوَرَةِ لِمَنْ بَعْدَهُ وَالِاسْتِظْهَارِ بِرَأْيِهِمْ[4] — بعد کے لوگوں کے لیے مشاورت کو قانونی حیثیت دے دینا اور اہل الرائے کی آراء سے مستفید ہونا ہے۔

۱ کتاب الام للامام الشافعی ج ۷، صفحہ ۸۶، بیہقی ج ۱۰، صفحہ ۱۰۹، فتح الباری ج ۱۳ بحوالہ ابن ابی حاتم ۲ احکام القرآن ج ۲ صفحہ ۴۹۔ ۳ البحر المحیط ج ۳ صفحہ ۹۹

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:-

"اس آیت میں مشورہ کرنے اور معاملات کو سربستہ رکھنے اور ان پر ہر پہلو سے غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی تصریح کر دی گئی کہ مشاورت شریعت میں مطلوب ہے اور یہ حکم بعض سرداران عرب کی مستبدانہ روش کے بالکل برعکس ہے کہ وہ معاملات کے نشیب و فراز پر غور و فکر اور مشورہ کیے بغیر حکم نافذ کر دیا کرتے تھے۔"[1]

اسلامی تمدن کا مشہور مورخ محمد بن طباطبائی کہتا ہے۔

"ہمارے نزدیک اس آیت کی صحیح توجیہ اور حقیقت سے قریب تر رائے یہ ہے کہ آں حضرت کو یہ حکم اس لیے دیا گیا تاکہ امت آپ کی اقتدا میں شوریٰ کی پابندی کر سکے۔"[2]

حکمِ شوریٰ اور آں حضرتؐ کی تعلیمات زیرِ بحث آیت کی ضمنی تحقیقات کے بعد آئیے شارحِ قرآنؐ کی اس سلسلہ کی ہدایات پر بھی ایک نظر ڈالیں۔

زندگی کے تمام معاملات میں احادیث ایک بنیادی ضابطہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، آپؐ کا فرمان مبارک ہے،

كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ[3] — ہر وہ کام جس پر ہماری جانب سے کوئی دلیل نہ ہو وہ مردود ہے۔

اس حکم کے ذریعے جب شریعت عوام مسلمین کو یہ حق دے چکی ہے کہ وہ تمام معاملات جو کتاب و سنت کی اساس پر قائم نہ ہوں وہ قابلِ رد ہیں اور امت انہیں کسی بھی صورت سے تسلیم نہیں کرے گی تو ایسی صورت میں ایک امیر کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام اہم اقدامات میں عوام یا ان کے قابلِ اعتماد نمائندوں کو مطمئن کرے کہ اس کا قدم جادۂ شریعت سے منحرف نہیں ہوا ہے اور تا آنکہ قوم اس کے دلائل پر مطمئن نہ ہو جائے وہ کسی کام کو عملی شکل نہ دے۔

یہی حقیقت ہے جسے شوریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے تحت امیر پیش آمدہ مسائل کو اربابِ حل و عقد کے روبرو ان کے غور و فکر کے لیے رکھتا ہے تاکہ راہِ حق و صواب متعین ہو جائے اور زیرِ بحث معاملہ ایک فرد کی رائے سے متجاوز ہو کر ایک قوم کی رائے کی شکل اختیار کرے۔

علامہ ابن عبدالبرؒ (المتوفی ۴۶۳ھ) نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ہمارے بیان کی پوری پوری

۱ البحر المحیط ج ۳ صفحہ ۹۹، ۲ الفخری صفحہ ۱۷۱ ۳ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ

تائید ہوتی ہے اور اس حدیث کی اصل مسند امام احمدؒ میں بھی موجود ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ اِنَّمَا الْاُمُوْرُ ثَلَاثَةٌ اَمْرٌ تَبَيَّنَ لَكَ رُشْدُهٗ فَاتَّبِعْهُ وَاَمْرٌ تَبَيَّنَ لَكَ غَيُّهٗ فَاجْتَنِبْهُ وَاَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِيْهِ فَكِلْهُ اِلٰى عَالِمِهٖ[1]

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ معاملات تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ تم پر اس کے سلسلہ میں راہِ صواب واضح ہو گئی پس اس کی اتباع کرو ایک وہ کہ اس کی ضلالت تم پر کھل گئی پس اس سے اجتناب کرو ایک وہ جس کے ہدایت یا ضلالت ہونے میں اختلاف ہوا سے اس کے جاننے والے کے حوالے کردو۔

•

اس حدیث کا حکم جس طرح افرادِ امت کے حق میں عام ہے اسی طرح اس کے عموم میں رہبرانِ امت بھی شامل ہیں، اس عموم سے انہیں مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:-

مَا عَلَّمَكَ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِكَ فَاحْمَدِ اللّٰهَ وَمَا اسْتَأْثَرَ بِهٖ عَلَيْكَ مِنْ عِلْمٍ فَكِلْهُ اِلٰى عَالِمِهٖ وَلَا تَتَكَلَّفْ[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا جو علم تمہیں دیا ہے اس پر اللہ کی تعریف کرو اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں دیا گیا اسے اس کے جاننے والے کے حوالے کردو۔

مذکورہ بالا حدیث اور عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس معاملہ میں کتاب و سنت کا واضح حکم نہ ہو وہاں عمل اس شخص کے قول کے مطابق ہوگا جو متعلقہ مسئلہ میں کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھتا ہو۔ شوریٰ کا بھی منشاء و مقصود ہے۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں:

اِذَا قَضَى الْحَاكِمُ بِجَوْرٍ اَوْ خِلَافَ اَهْلِ الْعِلْمِ فَهُوَ رَدٌّ[3]

جب حاکم ظلم سے یا اہلِ علم کے خلاف کوئی فیصلہ کرے تو وہ فیصلہ قابلِ رد ہوگا

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس "الجماعت" کے اتباع کا حکم دیا ہے اور جس سے خروج دین سے خروج کے مترادف بتایا گیا ہے، وہ اہلِ علم کی جماعت ہے[4]

[1] مختصر جامع بیان العلم و فضلہ ص۱۰۱ [2] اعلام الموقعین ج ۱ ص۴۸ [3] بخاری کتاب الاحکام
[4] بخاری کتاب الاعتصام

مشہور تابعی ابوالاسود دؤلیؒ فرماتے ہیں۔

اَلْمُلُوْكُ حُكَّامٌ عَلَى النَّاسِ وَالْعُلَمَاءُ حُكَّامٌ عَلَى الْمُلُوْكِ[1]

بادشاہ لوگوں پر حاکم ہیں اور علماء بادشاہوں پر۔

•

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اِنَّ اَعْمَالَ الْاُمَرَاءِ مَوْقُوْفَةٌ عَلٰى فَتَاوَى الْعُلَمَاءِ وَالْعُلَمَاءُ فِي الْحَقِيْقَةِ اُمَرَاءُ الْاُمَرَاءِ[2]

امراء کے اعمال علماء کے فتاویٰ پر موقوف ہیں۔ علماء درحقیقت امراء کے بھی امراء ہیں۔

اس ساری بحث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے ایک باب میں سمیٹ لیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ اجْتِهَادِ الْقُضَاةِ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِقَوْلِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ وَمَدَحَ النَّبِيُّ صَاحِبَ الْحِكْمَةِ حِيْنَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا وَلَا يَتَكَلَّفُ مِنْ قِبَلِهٖ وَمُشَاوَرَةِ الْخُلَفَاءِ وَسُؤَالِهِمْ اَهْلَ الْعِلْمِ[3]

امام بخاریؒ کے باب سے تین اصول ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۱) نصوص کی عدم موجودگی میں قاضی اجتہاد سے کام لے گا۔

(۲) لیکن یہ اجتہاد کتاب و سنت کے اصول پر مبنی ہوگا اس سے آزاد نہ ہوگا کیونکہ نصِ قرآنی کے مطابق جو شخص خدائی ہدایت کے تحت فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے ساتھ ہی آں حضرتؐ نے اس صاحبِ حکمت کی مدح و توصیف کی ہے جو اپنی حکمت سے احکامِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور جس بات کا علم نہ ہو اس کی خواہ مخواہ تکلف نہیں کرتا۔

(۳) تیسرا اصول یہ کہ خلفاء کو پیش آمدہ مسائل میں اہلِ علم سے مشورہ کرنا چاہیے اور ان سے نوعیتِ مسئلہ جان کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ (باقی)

[1] تذکرۃ السامع والمتکلم للقاضی بدرالدین ص۱۶ [2] تفسیر کبیر ج ۲ ص۱۸۹
[3] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

اس مضمون کی پہلی قسط، جو جولائی کے میثاق میں نکلی ہے، غلطی سے ناتمام حالت میں شائع ہوئی۔ مذکورہ قسط میثاق میں جس جگہ ختم ہوئی ہے اس کے بعد مندرجہ ذیل مضمون ہونا چاہیے تھا جو لکھنے سے رہ گیا۔ اس کے بعد وہ قسط پڑھیے جو اگست کے میثاق میں شائع ہوئی ہے۔ (ایڈیٹر)

خانوادۂ ابراہیمی ہی کے ایک مقدس پیغمبر حضرت یوسفؑ ملت ابراہیمی کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ (یوسف)

میں نے اپنے آباء و اجداد ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی پیروی کی ہمارا شیوہ نہیں کہ اللہ کو کسی کا ساجھی بنائیں۔

یہود و نصاریٰ کے دعوائے باطل (کونوا ھودا او نصاری تھتدوا، یعنی یہودی یا عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے) کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا، بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ بلکہ ابراہیم کی ملت کی جو یکسو تھا اور مشرک نہ تھا۔

آنحضرت صلعم کو بھی اسی ملت حنیفی کے اتباع کی تلقین کی گئی جس کی حقیقت شرک بیزاری تھی۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (نحل)

پھر ہم نے تم کو وحی کی کہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو جو ہر طرف سے کٹ کر صرف خدا کا ہو گیا تھا اور مشرک نہ تھا

پھر دوسری جگہ آپ کو خدا کے اس انعام اور ہدایت کے اعلان و اظہار کی اس طرح تلقین کی جاتی ہے:-

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

کہہ دو کہ میرے رب نے مجھے سیدھے راستہ یعنی سیدھے

دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (انعام)

دین ابراہیم کی ملت کی ہدایت کی اور ابراہیم ہر طرف سے کٹ کر خدا کا مطیع تھا اور مشرکین میں نہ تھا، کہو میری نماز، میری قربانی میری زندگی، میری موت سب پروردگار عالم کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھ کو حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔

اب غور کیجیے جس ذات گرامی کی ساری زندگی اسی مقصد اور نصب العین کے لیے وقف ہو اور جو اسی بنا پر اپنے باپ، اپنی قوم اور بادشاہ وقت کی مخالفت مول لے کر سخت ترین آزمائشوں میں ڈالا جاتا اور ملک وطن چھوڑ کر ایک ویرانہ میں چراغ آرزو جلاتا ہے، اور وہیں اس مقدس گھر کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ ساتھ ہی وہ بنائی تعمیر میں شریک ہے، جو صبر و تسلیم کا پیکر اور دعوت توحید پر لبیک کہنے والا اور اس کے لیے اپنے جان کی بازی لگا دینے والا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے اس گھر کی تعمیر کے وقت خدا سے مخلصانہ آرزوئیں اور سچی دعائیں کرتے ہیں کہ اسے کفر و شرک کی آلودگیوں سے بچا اور توحید، نماز، زکوٰۃ اور قربانی کے قیام کا ذریعہ بنا۔ پھر اس گھر سے بڑھ کر توحید، اخلاص حق، احسان، ایمان، اسلام اور اطاعت الٰہی کا مرکز اور کون گھر ہوگا؟ جو لوگ اس گھر کی زیارت کریں گے ان سے زیادہ کس کی زندگی اخلاص، توحید اور حق و صداقت کا مظہر ہوگی؟

حج و قربانی کے مناسک اور رسوم پر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی حقیقت یہی ہے کہ انسان دنیا کی تمام غلط اور باطل چیزیں ترک کر کے سب سے زیادہ سچی اور اچھی حقیقت یعنی خدا پرستی کو اختیار کرے اور نہ صرف اختیار کرے بلکہ اس کے لیے اس کے اندر جنون و سرمستی کی کیفیتیں پیدا ہو جائیں۔

اب ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب خانۂ کعبہ کے خدا پرستی اور توحید الٰہی کا مرکز ہونے کا بیّن اور روشن ثبوت ہیں اسی لیے اس گھر کی عظمت و برتری اور خیر و برکت کی کوئی حد نہیں ہے۔

۲۔ خانۂ کعبہ کی اہمیت اور فضیلت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے بابرکت اور مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور یہ شرف محض اسی گھر کو حاصل ہے کہ ابراہیمؑ جیسا برگزیدہ اور جلیل القدر پیغمبر[1] اس کا معمار ہے اور اسماعیلؑ جیسا اولوالعزم نبی[2] و ذبیح اس کا مزدور۔ یہ دونوں باپ بیٹے اس گھر کو ایک طرف

---

[1] وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (بقرہ)

[2] إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا (مریم)

بنا رہے تھے اور دوسری طرف خدا سے اپنی عاجزی اور مسکنت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ (بقرہ)

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو یہ دعا کر رہے تھے کہ پروردگار ہماری طرف سے اسے قبول کر، بیشک تو سننے اور جاننے والا ہے۔ اے رب تو ہم کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک امت مسلمہ اٹھا اور ہمیں ہمارے حج کے احکام بتا اور ہماری توبہ قبول کر بے شک تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بیت المقدس بھی انبیاء بنی اسرائیل کا مرکز اور ان کی عبادت گاہ ہے لیکن توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے پابند اور محکوم مزدوروں نے بنایا تھا اور یہی ان دونوں گھروں کا خاص فرق ہے کہ ایک کی خدا کے پیغمبروں نے بنیاد رکھی اور دوسرے کی تعمیر مزدوروں نے کی، اور گو دونوں کی بنیاد تقویٰ اور محبت الٰہی پر ہے لیکن ایک میں پیغمبرانہ سادگی اور قدرتی جمال و زیبائی ہے اور وہ بے آب و گیاہ سرزمین میں تعمیر کیا گیا، اور دوسرے میں قیمتی پتھر، نقرئی و طلائی اسباب سامان، بیش قیمت ظروف اور زینت و آرائش اور ظاہری چمک دمک کے تمام لوازم موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کعبہ کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی مقدس عبادت گاہ نہیں جو پیغمبرانہ ہاتھوں کی سادگی و پرکاری اور ان کی مقدس آرزوؤں اور دعاؤں کے ساتھ بنائی گئی ہو۔

(۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ اس گھر کو دونوں باپ بیٹوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی پرستش کے لیے بنایا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے اذن سے ہجرت کی اور اس کے حکم کے مطابق اپنی محبوب ترین اولاد کو اس گھر کے قریب آباد کیا تاکہ وہ اس کی خدمت و حفاظت کرے اور خدائے واحد کی پرستش اور نماز و زکوٰۃ قائم کرے اور اس کا شرک و بت پرستی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

اے میرے رب میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ یہ نماز قائم کریں۔

"عند بیتک المحرم" کے لفظ سے اشارہ ہوتا ہے کہ بیت اللہ کے آثار و نقوش پہلے سے موجود تھے اور وہیں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے حضرت اسماعیل کو بسایا تاکہ ان کی اولاد اس اعلیٰ و ارفع مقصد کو حاصل کرے

جس کے لیے کعبہ تعمیر ہوا تھا اور ان کی نسل سے وہ پیغمبر پیدا ہو جو ابراہیمی مشن کو از سر نو زندہ کر دے اور لوگوں کو عشق و محبت الٰہی میں سرشار کر دے۔

قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس گھر کو خدا کے حکم سے پاکیزہ اور بلند مقاصد کے لیے بنایا تھا (جیسا کہ سبب اول کے ذکر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے) اور خدا نے اس کی جگہ اور اس کے مقام کی تعین کر دی تھی جیسا کہ "عند بیتک المحرم" سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری جگہ ہے:-

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا (حج)

اور جب کہ ہم نے ابراہیم کو ٹھہرایا بیت اللہ کی جگہ اس ہدایت کے ساتھ کہ میرا کسی کو شریک نہ بنانا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:-

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے مستقر کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسمٰعیل کو مامور کیا کہ میرے گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

اب اس کے مقابلہ میں کسی اور عبادت گاہ کو نہیں داؤد و سلیمانؑ کے ہیکل کو دیکھیے کہ حضرت داؤد نے اسے بنانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کر دیا کہ اس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کریں گے، اور حضرت سلیمانؑ نے اپنی مرضی سے اسے جس جگہ چاہا بنایا، خدا نے کسی مقام اور جگہ کی تعیین نہیں کی تھی۔

بقیہ تقریظ و تنقید

نزدیک صحیح نہیں۔

تعلیم القرآن کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ متن شریف میں اعراب اور الفاظ کی اغلاط بے شمار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناشرین نے اس ضمن میں بالکل کوئی توجہ نہیں کی۔ کاغذ البتہ اچھا ہے۔ (خ۔م)

نقد ولظر و تنقید

تعلیم القرآن (پارہ دوم)

تصنیف :- قاضی محمد زاہد الحسینی

صفحات :- ۶۴ ہدیہ مع محصول ڈاک : ایک روپیہ سات آنے

ملنے کا پتہ : دارالارشاد ، گنج جدید ، ایبٹ آباد ۔

فاضل مولف قرآن مجید کا محشی ترجمہ لکھ رہے ہیں ۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا دوسرا پارہ ہے ۔ پہلے متن شریف کے بین السطور تحت اللفظ ترجمہ دیا گیا ہے پھر حاشیہ میں ضروری نوٹ نمبروار درج کیے گئے ہیں ۔ ترجمہ اور حاشیہ دونوں میں تفسیر کی سابقہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ مولف نے عام طور پر اختلافی مسائل اور احکام کی فقہی تفصیلات دینے سے اجتناب کیا ہے ، اس لیے حاشیہ کے مندرجات ضروری تشریحات تک ہی محدود ہیں ۔ ہمارے خیال میں عوام کے لیے یہ ترجمہ وحاشیہ مفید ہوگا ۔

اس کے مطالعہ کے دوران میں چند چیزیں محتاج اصلاح بھی نظر آئیں ۔ مثلاً فاضل مولف نے تحت اللفظ ترجمہ لکھنے کا اہتمام اس قدر زیادہ کیا ہے کہ بعض جگہوں پر مفہوم گنجلک ہوگیا ہے ۔ ایسی جگہوں پر مولف کے توسین میں دیئے ہوئے اضافے بھی مفہوم کو واضح نہیں کرتے ۔ کہیں کہیں مولف کا دیا ہوا ترجمہ قرآن مجید کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ مثلاً آیت ۱۴۴ میں حق کا ترجمہ "مستقل رہنے والا" آیت ۱۶۴ میں آیات کا ترجمہ "نمونے" آیت ۱۸۴ میں ان تصوموا خیرلکم کا ترجمہ "روزہ رکھنا ضروری ہے" اور آیت ۱۹۶ میں فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج کا ترجمہ "پس اگر تم نے بے خوفی سے نفع اٹھایا عمرہ کا ساتھ حج کے" ۔ اس کے علاوہ آیت ۲۱۵ میں والاقربین کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے ۔ نوٹ ۲۸۰ میں مولف کے خیبو (بالمقابل شر) کا ترجمہ 'ضروری' کرنے سے ہم اتفاق نہیں رکھتے ۔ نوٹ ۳۳۳ میں میسر کی تشریح میں مولف کا یہ لکھنا کہ ہر وہ مال میسر کہلاتا ہے جو بلا مشقت حاصل ہو مثلاً رشوت وغیرہ ، ہمارے نزدیک محل بحث ہے ۔ یہ لفظ عربی میں جوئے کے لیے خاص ہوگیا ہے ۔ متعوھن کی تشریح میں متعہ کو ایک جوڑا کپڑے سے محدود کرنا بھی ہمارے (باقی صہ ۵۵)